سلسلۂ مطبوعاتِ جماعتِ اسلامی (۱۲)

مسئلۂ جبر و قدر

تالیف

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

مکتبہ جماعتِ اسلامی

دارالاسلام - جمال پور - پٹھانکوٹ

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصولڈاک

تفہیمات

بعض معرکۃ الآرا مسائلِ اسلامی کی تشریح و توضیح

یہ کتاب مؤلف کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جن میں اسلام کے اُن مہمات مسائل کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے جنکے متعلق آجکل عموماً لوگوں میں غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں مثلاً توحید، ہدایت و ضلالت، عبادت، جہاد، آزادی رواداری، قومیت اسلامی، عقیدۂ توحید کے ساتھ ایمان بالرسالت کا ضروری ہونا، رسُول کی صحیح حیثیت، رسالت محمدی کا ثبوت عقلی، شریعت اسلامی میں حدیث کی اہمیت، قرآن اور حدیث کا باہمی تعلق، مُنکرین حدیث کے شبہات کا ازالہ وغیرہ۔ حصہ دوم زیر طبع ہے اور وہ بھی ایسے ہی اہم مسائل پر مشتمل ہے۔ قیمت بجلد (۳ روپے) علاوہ محصولڈاک

تنقیحات

تنقیحات } یہ مولف کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جنمیں اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم اور اس سے پیدا شدہ مسائل پر تنقیدی اور تعمیری دونوں حیثیتوں سے بحث کی گئی ہے۔ مُسلمانوں کی زندگی پر جن جن پہلوؤں سے مغربی تہذیب و تمدن اور مغربی تعلیم نے اثر ڈالا ہے۔ قریب قریب ان سب پر ان مضامین میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور ان اُلجھنوں کو صاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو مغرب سے مرعوب اور اسلام سے ناواقف ہونے کی بدولت عموماً مسلمانوں کے ذہن میں پیدا ہو گئی ہیں۔

ضخامت ۲۴۰ صفحات۔ قیمت غیر مجلد دو روپے آٹھ آنے علاوہ محصولڈاک

سلسلۂ مطبوعات ادارۂ دارالاسلام نمبر ۱۰

مسئلۂ جبر و قدر

تالیف

سید ابوالاعلیٰ مودودی

شائع کردہ

مکتبہ جماعت اسلامی۔ دارالاسلام۔ پٹھان کوٹ
(پنجاب)

قیمت ایک روپیہ

ناشر

مکتبہ جماعتِ اسلامی، دار الاسلام، پٹھان کوٹ

مطبوعہ جمال پریس دہلی

فہرست مضامین

مقدمہ	۴	قرآن مجید سے قدریہ کا استدلال	۳۴
مسئلۂ جبر و قدر کی حقیقت	۱۱	مذہب جبر	۳۹
اختیار و اضطرار کا ابتدائی اثر	۱۱	قرآن مجید سے جبریہ کا استدلال	۴۲
مسئلۂ جبر و قدر کا نقطۂ آغاز	۱۲	متکلمین کی ناکامی	۴۸
مابعد الطبیعی نقطۂ نظر	۱۴	خلاصۂ مباحث گزشتہ	
فلسفہ کی ناکامی	۱۸	**تحقیق مسئلہ**	۵۰
طبیعی نقطۂ نظر	۲۰	امور ماوراء طبیعت کے بیان سے قرآن کا مقصد	۵۱
سائنس کی ناکامی	۲۳	مسئلۂ قضا و قدر کے بیان کا منشا	۵۳
اخلاقی نقطۂ نظر	۲۵	عقیدۂ تقدیر کا فائدہ عملی زندگی میں	۵۶
اخلاقیات کی ناکامی	۲۹	تناقض کی تحقیق	۵۸
دینیاتی نقطۂ نظر	۳۰	**حقیقت کی پردہ کشائی**	۶۹
صحیح اسلامی مسلک	۳۱	مخلوقات میں انسان کی امتیازی حیثیت	۶۹
متکلمین اسلام کے مذاہب	۳۳	ہدایت و ضلالت	۷۱
مذہب قدر	۳۴	عدل اور جزا و سزا	۷۵

جبر و قدر ۷۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

اس مختصر رسالہ کی تقریب یہ ہے کہ ۱۳۵۲ھ (۱۹۳۳ء) میں جب میں نے "ترجمان القرآن" نیا نیا جاری کیا تھا، ایک صاحب نے مجھے ایک طویل خط لکھا جس میں اُس پیچیدگی کو حل کرنے کی درخواست کی گئی تھی جو قرآن کا مطالعہ کرنے والے کو جبر و قدر کے مسئلہ میں پیش آتی ہے، کیونکہ بعض آیات اس کے سامنے ایسی آتی ہیں جن سے جبریت کا مفہوم نکلتا ہے اور دوسری آیات صریح اور پر قدریت کی تائید کرتی ہیں، اور بظاہر ان دونوں قسم کی آیتوں میں ایسا تناقض محسوس ہوتا ہے جسے آسانی کے ساتھ رفع نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے اس خط کو بجنسہٖ رسالہ میں شائع کر دیا اور اس کے جواب میں یہ مضمون لکھا جو اس وقت کتابی شکل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

وہ خط یہ تھا:-

"انسان کا مکلف بجزا و سزا ہونا ہی اس بات کا مقتضی ہے کہ اعمال و افعال اس کے ارادہ و نیت کے تابع ہوں اور اس ارادہ و نیت پر کسی اور طاقت کا تصرف نہ ہو۔ قرآن حکیم کی ساری تعلیم کا لب لباب یہی ہے کہ انسان کو اس کے اعمال کا ذمہ دار قرار دے کر باز پرس کا مستوجب ٹھہرایا جائے۔ ضلالت و ہدایت، عذاب و ثواب، نکبت و ثروت، مصیبت و راحت، غرضیکہ دنیا و آخرت کی حیات کے وہ تمام پہلو جو قدرتی نتائج ہوں، اس کے اپنے اعمال کے، اور یہ نتائج مرتب ہوں کسی خاص قاعدۂ کلیہ کے ماتحت۔ لیکن قرآن مجید کی بعض آیات سے ایسا بھی پایا جاتا ہے کہ انسانی ارادہ خود مشیت ایزدی کا تابع ہے

مثلاً ضلالت وہدایت کے متعلق ایک طرف تو ایسی کھلی کھلی اور واضح آیات موجود ہیں جن سے نور وظلمت، ایمان وکفر، ہدایت وضلالت کی راہوں کا اختیار کرنا انسان کے اپنے ارادوں اور مساعی کے ماتحت قرار دیا گیا ہے:

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا	ہم نے اس کو راستہ دکھلا دیا ہے، چاہے تو شکرگزار
وَّ اِمَّا كَفُوْرًا	ہو اور چاہے تو ناشکرگزار بن کر رہے۔
وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ	اور ہم نے اس کو دونوں راستے دکھا دیئے ہیں
وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا	جو لوگ ہمارے معاملہ میں جدوجہد اور کوشش سے
لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا	کام لیتے ہیں ہم ان کو اپنے راستے دکھاتے ہیں
فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَاءَ	جو کوئی چاہے ایمان لے آئے اور جو کوئی چاہے
فَلْيَكْفُرْ	ایمان نہ لائے۔
لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى	انسان کو اس کی اپنی کوشش ہی کا ثمرہ ملے گا

دوسری طرف ایسی آیات بھی ہیں جن میں ان چیزوں کو مشیتِ ایزدی کے تابع بتایا گیا ہے مثلاً:

فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَاءُ وَيَهْدِيْ	پس اللہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور
مَنْ يَّشَاءُ (ابراہیم)	جس کسی کو چاہتا ہے ہدایت دے دیتا ہے
مَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا اِلَّا اَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ (انعام)	وہ ہرگز ایمان لانے والے نہ تھے الّا یہ کہ اللہ چاہتا۔

سورۂ مدثر میں جہاں فَمَنْ شَاءَ ذَكَرَهٗ (جو کوئی چاہے اس سے نصیحت حاصل کرے) اور سورۂ تکویر میں اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ لِمَنْ شَاءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ (یہ ایک نصیحت ہے تمام دنیا والوں کے لئے تم میں سے ہر اس شخص کے لئے جو سیدھا چلنا چاہے) کہہ کر قرآن کریم سے ہدایت حاصل کرنے کے لئے انسانی ارادہ کو اختیار دیا گیا تھا، اس کے ساتھ ہی آیات وَمَا يَذْكُرُوْنَ اِلَّا

اِنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ (نصیحت حاصل کر ہی نہیں سکتے اگر اللہ نہ چاہے) اور وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ (تم کیا چاہتے ہو اگر اللہ نہ چاہے) سے اس ارادہ کو مشیّت باری تعالیٰ کے تحت قرار دے کر سلب کر دیا گیا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اکثر جگہ گمراہی کے لئے یہ اصول قائم کر دیا گیا ہے کہ :-

وَمَا یُضِلُّ بِہٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ	وہ اس قرآن کے ذریعہ سے صرف بدکاروں ہی کو گمراہ کرتا ہے۔
وَیُضِلُّ اللّٰہُ الظّٰلِمِیْنَ	اور اللہ حد سے گذرنے والوں کو گمراہ کر دیتا ہے۔
بَلْ طَبَعَ اللّٰہُ عَلَیْھَا بِکُفْرِھِمْ	بلکہ اللہ نے ان پر ان کے انکار کی وجہ سے مہریں لگا دیں
صَرَفَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ بِاَنَّھُمْ	اللہ نے ان کے دلوں کو پلٹ دیا کیونکہ وہ ایسے
قَوْمٌ لَّا یَفْقَھُوْنَ	لوگ تھے جو سمجھتے نہ تھے۔
وَمَا کَانَ اللّٰہُ لِیُضِلَّ قَوْمًا	اور اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ کسی قوم کو ہدایت دینے
بَعْدَ اِذْ ھَدٰھُمْ حَتّٰی یُبَیِّنَ لَھُمْ	کے بعد اسے گمراہ کرے جب تک کہ اس کو یہ بتا نہ دے
مَّا یَتَّقُوْنَ	کہ انہیں کس بات سے بچنا چاہئے۔

اور ہدایت کے لئے بھی ایسی شرائط بیان فرما دی ہیں :-

یَھْدِیْٓ اِلَیْہِ مَنْ اَنَابَ	جو کوئی اس کی طرف رجوع کرتا ہے وہ اسکو اپنی طرف ہدایت دیتا ہے۔
وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا	جو لوگ ہماری راہ میں جد وجہد اور کوشش سے کام
لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا	لیتے ہیں ہم ان کو اپنے رستے دکھاتے ہیں۔
وَالَّذِیْنَ اھْتَدَوْا زَادَھُمْ	جو لوگ ہدایت قبول کرتے ہیں اللہ ان کو اور زیادہ
ھُدًی	ہدایت دیتا ہے۔

اور اسی قبیل سے اور متعدد آیت قرآنی ہیں لیکن ان کے ساتھ ہی ایسی آیات بھی تو ہیں جن میں بغیر

کسی شرط و قید کے ضلالت و گمراہی کو مشیت باری تعالیٰ یا فضل ایزدی کے تابع رکھا گیا ہے، مثلاً آیت محولہ بالا يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ (جس کسی کو اللہ چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جس کسی کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے) اور وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (تم کیا چاہتے ہو اگر اللہ نہ چاہے)

اسی طرح عذاب و مغفرت کے بارے میں جہاں ایک طرف صاف و بیّن اصول مقرر فرمایا ہے کہ:-

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ۔	جو کوئی ذرہ بھر نیکی کریگا وہ اس کا نیک اجر دیکھے گا۔
لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ۔	جو کچھ نیکی اس نے کمائی اس کا فائدہ اس کیلئے ہے اور جو بدی اس نے کمائی اس کا وبال اس پر ہے۔
مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا۔	جو کوئی نیک کام کرے گا اس کا وہی فائدہ اٹھائے گا اور جو کوئی برا کام کرے گا اس کی سزا وہی بھگتے گا۔

دوسری طرف یہ بھی قرآن حکیم میں ہے کہ:-

يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ۔	جس کو چاہے بخش دے، اور جس کو چاہے سزا دے۔

یعنی عذاب و مغفرت بھی مشیت ایزدی کے تابع ہیں۔ مغفرت میں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ارحم الراحمین، غافر الذنب اپنی شان کریمی سے گنہگار کو بخش دے گا لیکن يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ کی تاویل مشکل ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ معنی لیے جا سکتے ہیں کہ گنہگاروں میں سے يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ لیکن پوری آیت کا قرینہ اس کی طرف قوی دلالت نہیں کرتا۔

نکبت و ثروت کے لئے بھی قرآن حکیم میں اقوام گذشتہ کی تاریخی شہادتوں سے اس اصول کی تائید کی گئی ہے کہ جاہ و اقبال حاصل ایمان و تقویٰ، پاکباز زندگی، اعمال صالح اور قانون فطرت کی پابندی کے ساتھ لازم و ملزوم ہے اور اس کے خلاف چلنے سے ذلت و مسکنت، غضب الٰہی کی شکل میں طاری ہو جاتی ہے

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ:-

وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَ — اور اگر وہ تورات اور انجیل پر اور ان تعلیمات پر قائم رہتے

الْإِنْجِيلَ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ لَأَكَلُوا — جو ان کی طرف نازل کی گئی تھیں تو وہ اوپر سے اور اپنے

مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ أَرْجُلِهِمْ — پاؤں کے نیچے سے کھانے کا سامان پاتے۔

یا اور متعدد آیات لیکن دوسری طرف یہ آیات بھی قرآن شریف میں ہیں:-

وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ۔ — اللہ جس کسی کو چاہتا ہے بے حساب دے دیتا ہے

وَاللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ — اللہ جس کسی کے لئے چاہتا ہے روزی فراخ کر دیتا ہے

وَيَقْدِرُ لَهُ۔ — اور جس کسی کے لئے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔

تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ — جس کسی کو تو چاہتا ہے غالب کر دیتا ہے اور جس

تَشَاءُ۔ — کسی کو چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے۔

مصیبت و راحت کے باب میں بھی کھلا کھلا فیصلہ ہے کہ:-

مَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ — تمہیں جو کچھ بھی مصیبت پہنچتی ہے اپنے ہی

فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ — ہاتھ سے پہنچتی ہے۔

لیکن دوسری طرف یہ آیت بھی ہمارے سامنے ہے کہ:-

وَإِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَقُولُوا — اور اگر ان کو کوئی فائدہ پہنچے کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی

هٰذِهِ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَإِنْ تُصِبْهُمْ — جانب سے ہے اور اگر کوئی نقصان ہو جائے تو کہتے ہیں

سَيِّئَةٌ يَقُولُوا هٰذِهِ مِنْ عِنْدِكَ — کہ یہ تیری طرف سے ہے۔ ان کو بتادے کہ نفع نقصان

قُلْ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔ — جو کچھ ہوتا ہے اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔

لیکن كُلٌّ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ کے ساتھ ہی دوسری آیت میں ہے کہ:-

مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ — ہر بھلائی جو تمہیں حاصل ہوتی ہے اللہ کی جانب سے

اللهِ وَمَا اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ۔ (نساء) — ہوتی ہے اور ہر برائی جو تمھیں پیش آتی ہے وہ تمھاری اپنی وجہ سے ہوتی ہے۔

قرآن حکیم کے بعد اگر ہم احادیث کی طرف آئیں تو بہت سی احادیث انسان کے مجبور و مقہور ہونے پر دلالت کرتی ہیں، مثلاً:-

اِذَا سَمِعْتُمْ بِجَبَلٍ زَالَ عَنْ مَكَانِهٖ فَصَدِّقُوْا بِهٖ وَاِذَا سَمِعْتُمْ بِرَجُلٍ تَغَيَّرَ عَنْ خُلُقِهٖ فَلَا تُصَدِّقُوْا بِهٖ فَاِنَّهٗ يَصِيْرُ اِلٰى مَا جُبِلَ عَلَيْهِ (جب تم سنو کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل گیا تو اس کی تصدیق کر سکتے ہو، لیکن اگر سنو کہ ایک شخص اپنی طینت سے ہٹ گیا تو اس کی ہرگز تصدیق نہ کرنا کیونکہ آدمی ویسا ہی ہو کر رہتا ہے جیسا اس کا خمیر ہے)۔

اِنَّ الْقُلُوْبَ بَيْنَ اِصْبَعَيْنِ مِنْ اَصَابِعِ اللهِ يُقَلِّبُهَا كَيْفَ يَشَآءُ (دل اللہ کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں، جس طرح چاہتا ہے انھیں پھیرتا ہے)۔

یا ایک حدیث شریف میں ہے کہ "لوگ مختلف مدارج میں پیدا کئے گئے ہیں ان میں سے بعض مسلمان پیدا کئے گئے ہیں"...... الخ

میں نے اعتراضات مختصراً لیکن من و عن پیش کر دئے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ تقدیر کا مسئلہ بھی اتنا ہی پرانا ہے جتنا دنیا میں مذہب کا وجود۔ اور یہ بھی کچھ لاینحل سا ہی۔ ہر ایک مذہب نے اس کے متعلق کچھ نہ کچھ کہا ہے لیکن افراط و تفریط کر کے ہندوستان و یونان میں اگر تناسخ کے چکر اور جنم لیکھا سے انسان کو کلیتہً مجبور محض بنا دیا گیا ہے، تو ایران کے آتشکدوں میں خدا کو بھی معطل محض بنا دیا گیا ہے۔ حکمائے فرنگ کے ایک فرقہ نے اگر خدائے خالق کو ایک گھڑی ساز کی طرح سمجھا کہ جو ایک دفعہ گھڑی بنا دینے کے بعد اسے اصول اور قاعدے کے تحت چھوڑ کر خود عضو معطل ہو جاتا ہے، تو ہمارے ہاں کے جبریہ و قدریہ کی بحثیں بھی کم تشنہ نہیں ہیں۔ یہ درست ہے کہ نظری لحاظ سے

اس باب میں ایمان وعقل کے دونوں پلڑوں میں توازن مشکل ہو جاتا ہے لیکن اسے کَمَا هُوَ چھوڑا بھی نہیں جا سکتا۔ ہر چند میرے نزدیک مسئلہ قضا و قدر جزو ایمان نہیں ہے اور اس کی حیثیت ایک مسئلہ کی ہے لیکن چونکہ قرآنی آیات میں بقول معترضین بظاہر تضاد نظر آتا ہے اس لئے اس مسئلہ پر غور کرنا ضروری ہے۔

مسئلہ ہر چند بہت پرانا ہے اور اس پر مخالف و موافق بہت کچھ لکھا ہوا ہمارے پاس موجود ہے لیکن چونکہ

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور

اس لئے دور حاضر کے طرز استدلال و استنباط نتائج کے مطابق اس کے متعلق بھی گفتگو کی جانی ضروری ہے"

اگرچہ یہ رسالہ ابتداءً اسی خط کے جواب میں لکھا گیا تھا، اور اس کے لکھنے کا اصل مقصد اس تعارض کو رفع کرنا تھا جو قرآن مجید کی بعض آیات کے درمیان بظاہر نظر آتا ہے، لیکن اس کے ضمن میں جو مسائل زیر بحث آگئے ہیں وہ مسئلہ جبر و قدر کی اس گتھی کو سلجھانے میں اُن تمام لوگوں کو مدد دے سکتے ہیں جو فلسفہ، اخلاقیات، عمرانیات، اور دوسرے شعبہائے علم میں اس گتھی سے دوچار ہوتے ہیں۔ اسی فائدے کو ملحوظ رکھ کر اس سلسلۂ مضامین کو اب کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔ آخر میں اپنے ایک اور مضمون کو بھی میں نے اس کے ساتھ ضمیمہ کے طور پر لگا دیا ہے جس سے اسی مسئلے کی مزید توضیح ہوتی ہے۔

ابوالاعلیٰ

مسئلۂ جبر و قدر کی حقیقت

جہاں تک پیش کردہ سوال کا تعلق ہے، اس کے جواب میں تو صرف اسی قدر کافی ہو سکتا ہے کہ قرآن مجید کی آیات میں وجہ تطبیق بیان کر کے اس تناقض کو دفع کر دیا جائے جو بظاہر ان میں نظر آتا ہے لیکن اس وجہ تطبیق کے بیان میں بہت سے ایسے امور کی طرف اشارہ ناگزیر ہے جن کو ذرا تفصیل و تشریح کے ساتھ ذہن نشین کئے بغیر مدعا کو سمجھنا بہت مشکل ہو گا۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کے ارشادات پر بحث کرنے سے پہلے مسئلۂ جبر و قدر کی اصلیت اور اس کے مالہٗ و ما علیہ پر نظر ڈال لی جائے۔

اختیار و اضطرار کا ابتدائی اثر ہر شخص بلا کسی غور و فکر کے محض وجدانی طور پر یہ تصور رکھتا ہے کہ انسان اپنی ارادی حرکات و سکنات میں آزاد ہے، اور جو فعل وہ اپنے ارادہ و اختیار سے کرتا ہے اس کے لئے وہ ذمہ دار و جواب دہ ہے، اچھے افعال کے لئے مدح و تحسین اور جزا و انعام کا مستحق ہے اور بُرے افعال کے لئے ملامت و سزا کا مستوجب۔ اس سادہ اور وجدانی تصور میں کہیں اس خیال کا شائبہ بھی نہیں ہوتا کہ آدمی اپنے سوچے سمجھے ہوئے افعال میں کسی خارجی یا باطنی قوت سے مجبور بھی ہوتا ہے جہاں فی الواقع مقہوری و مجبوری کے آثار نظر آتے ہیں وہاں ارادہ و اختیار کے بجائے اضطرار و بے اختیاری کا حکم لگایا جاتا ہے، انسان کی ذمہ داری و جواب دہی ختم ہو جاتی ہے، مدح و ذم اور سزا و جزا کا استحقاق باقی نہیں رہتا، اور ایسے حالات کو اس قابل نہیں سمجھا جاتا کہ ان پر انسان کے نیک یا بد اور اچھے یا بُرے ہونے کا فیصلہ کیا جائے۔ اگر کوئی شخص کسی کو پتھر مارے یا گالی دے تو اس کے دل میں یہ خیال تک نہیں آتا کہ اس شخص نے یہ فعل کسی اور طاقت کے جبر سے کیا ہے، بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ اس نے قصداً مجھے تکلیف پہنچانے کے لئے ایسا کیا ہے، اور اسی لئے

وہ اس کو ذمہ دار قرار دے کر جواب میں گالی یا پتھر سے اس کی تواضع کرتا ہے۔ لیکن اگر وہی شخص دیوانہ ہو تو اس کی گالی یا پتھر کو کوئی بھی قصد و اختیار پر محمول نہیں کرتا بلکہ اسے مجبور و مضطر قرار دے کر تمام افعال کی ذمہ داری سے بری سمجھتا ہے۔

یہی اضطراری اور اختیاری، ارادی اور تسخیری اعمال کا فرق، جس کا تصور پہلے سے ہمارے ذہن میں موجود ہے اُس معیار کی بنیاد ہے جو ہم نے انسان کے نیک اور بد ہونے اور اس کے قابل جزا یا مستوجب سزا ہونے کے لئے قائم کیا ہے۔ ہم ایک بچے یا ایک پاگل کو اُس کے برہنہ پھرنے پر کبھی ملامت نہیں کرتے مگر ایک عاقل و بالغ آدمی بحالت عریانی باہر نکل آئے تو اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ کسی شخص کا منہ قدرتی طور پر خراب ہو تو کوئی اُسے دیکھ کر برا نہیں مانتا، لیکن اچھے خاصے منہ والا اگر ہمیں دیکھ کر منہ چڑائے تو ہمیں ناگوار ہوتا ہے۔ بخار کا مریض حالتِ بحران میں لایعنی باتیں بکتا ہے اور ہم اسے کچھ الزام نہیں دیتے، مگر عالمِ ہوش میں کوئی شخص ایسی باتیں کرے تو اُس پر ملامت کی بوچھاڑ ہونے لگتی ہے۔ اندھا آدمی اپنی چیز کے بجائے کسی دوسرے کی چیز اٹھا لے تو ہم اس پر چوری کا الزام نہیں لگاتے، مگر آنکھوں والا یہی حرکت کرے تو اسے فوراً پکڑ لیتے ہیں۔ کوئی شخص کسی دباؤ کے تحت نیکی کرے تو اس کی تعریف نہیں کی جاتی۔ مگر بغیر کسی دباؤ کے نیک عمل کرنے والے کی سب تعریف کرتے ہیں۔ بچہ اگر گناہ نہیں کرتا تو اس کو نیک نہیں کہا جاتا۔ البتہ جوان آدمی کے عملِ صالح پر نیکی کا حکم لگایا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ ظاہر حالات کو دیکھتے ہوئے ہم پہلے سے یہ سمجھتے ہیں کہ انسان بعض افعال میں مختار ہے اور بعض میں مجبور، اور پھر وجدانی طور پر ہم یہ رائے رکھتے ہیں کہ ذمہ داری و جواب دہی اور اس کی بنیاد پر مدح و ذم اور سزا و جزا کا استحقاق کلیتہً اختیاری افعال پر مترتب ہوتا ہے، نہ کہ اضطراری افعال پر۔

مسئلۂ جبر و قدر کا نقطۂ آغاز

لیکن جب انسان غور و فکر کر کے ظواہر اشیاء کی تہ میں پوشیدہ حقائق کا پتہ چلانے کی کوشش کرتا ہے تو اس پر منکشف ہوتا ہے کہ ظاہر میں وہ اپنے آپ کو جتنا قادر و مختار سمجھتا ہے اتنا نہیں ہے،

اور سطحی نظر سے وہ اپنی مجبوری اور اپنے اضطرار کے لئے جو حد و دمقرر کرتا ہے حقیقت میں وہ بہت زیادہ کھلی ہوئی ہیں یہی نقطہ ہے جہاں سے مسئلہ جبر و قدر کا آغاز ہوتا ہے۔ اس مسئلہ کی بنیاد جن سوالات پر ہے وہ یہ ہیں:۔

(۱) کیا انسان اپنے اعمال میں بالکل مجبور ہے یا کسی حد تک اس کو آزادی بھی حاصل ہے؟

(۲) انسان کو مجبور کرنے والی یا اس کی آزادی کو پابند کرنے والی طاقت کونسی ہے اور اس کے اثرات انسان کی زندگی میں کس حد تک ہیں؟

(۳) اگر انسان پابند یا مجبور ہے تو اعمال کی ذمہ داری و جواب دہی اور ان پر مدح و ذم یا جزا و سزا کے استحقاق کا قاعدہ، جس پر ہمارے اخلاقی تصورات مبنی ہیں اور جو ہمارے نظام اجتماعی کی صلاح و فلاح کا ضامن ہے، کس اساس پر قائم ہوگا؟

دنیا کے ارباب فکر نے ان سوالات پر مختلف نقطہ ہائے نظر سے نگاہ ڈالی ہے، ان کے حل کے مختلف طریقے اختیار کئے ہیں، اور مختلف دلائل و شواہد کی بنا پر مختلف نظریے قائم کئے ہیں۔ اس باب میں اہل علم و تحقیق کے مقالات اور ان کے اختلافات اتنے کثیر ہیں کہ ان سب کا احاطہ مشکل ہے لیکن اصولی حیثیت سے ہم ان سب کو چار قسموں پر تقسیم کر سکتے ہیں:۔

۱- وہ جنھوں نے مابعد الطبیعی نقطۂ نظر سے اس مسئلہ پر بحث کی ہے۔

۲- وہ جنھوں نے طبیعی نقطۂ نظر اختیار کیا ہے۔

۳- وہ جنھوں نے اخلاقی نقطۂ نظر سے اس کو دیکھا ہے۔

۴- وہ جنھوں نے دینی نقطۂ نظر سے اس پر نگاہ ڈالی ہے۔

آئیے اب ہم دیکھیں کہ ان مختلف پہلوؤں سے مختلف گروہوں نے کس طرح اس مسئلہ پر غور کیا ہے، بحث و استدلال کی کون کون سی راہیں اختیار کی ہیں اور آخر میں کن نتائج پر پہنچے ہیں۔

مابعد الطبیعی نقطۂ نظر

مابعد الطبیعیات (Metaphysics) میں جبر و قدر کا مسئلہ دو پہلوؤں سے آتا ہے:۔

اول ۔ قدرت سے مراد ہم یہ لیتے ہیں کہ فاعل ایک ایسی ہستی ہو جس سے فعل کا صدور اور عدم صدور دونوں صحیح ہوں، یا بالفاظ دیگر وہ چاہے تو فعل کرے اور نہ چاہے تو نہ کرے۔ قدرت کی یہ تعریف مان لینے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ترکِ فعل پر فعل کی ترجیح، یا اس قدرت کا قوت سے فعل میں آنا کسی سبب سے ہوتا ہے یا بلا سبب؟ اگر بلا سبب ہو تو ترجیح بلا مرجح اور مسبّب بلا سبب لازم آتا ہے جو خلاف عقل ہے۔ اور اگر اس کے لئے کسی مرجّح یا سبب کا ہونا ضروری ہو تو وہ کون ہے؟ جبریہ کہتے ہیں کہ وہ مرجّح ایسے اسباب و داعیات ہیں جن کا رشتہ انسان کے ہاتھ میں نہیں بلکہ ایک بالاتر قوت کے بس میں ہے جسے چاہو خدا کہہ لو، چاہو علّت العلل اور مسبب الاسباب، یا قانونِ فطرت وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرو۔ اور قدریہ کہتے ہیں کہ وہ انسان کا اپنا ارادہ ہے۔ جبریہ کے قول سے لازم آتا ہے کہ خیر و شر دونوں کا مرجع خدا کی ذات ہو، کائنات میں انسان کی حیثیت محض جمادات و نباتات کی سی ہو، اور انسان کی ذمہ داری بالکل ساقط ہو جائے۔ قدریہ کے قول سے لازم آتا ہے کہ انسان کا ارادہ خدا کے دائرۂ خلق و ابداع سے خارج ہو، اور کائنات میں خدا کے سوا ایک اور چیز بھی ایسی ثابت ہو جو غیر مخلوق ہے۔ کیونکہ اگر انسان کے ارادہ کا خالق خدا نہیں ہے تو خود انسان بھی اس کا خالق نہیں ہے، اس لئے کہ انسان خود مخلوق خدا ہے۔ لہٰذا مخلوق کے ارادہ کا غیر مخلوق ہونا لازم آتا ہے جو ایک نہایت ناقابلِ قبول بات ہے۔

دوم ۔ دلائل عقلیہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ صانع کائنات کا علیم اور مُرید[1] ہونا ضروری ہے کیونکہ

---

[1] ارادہ کرنے والا یا صاحب ارادہ۔

اگر صانع کو اس چیز کا علم نہ ہو جس کو وہ بنانے والا ہے، اور وہ اس کے بنانے کا ارادہ نہ کرے تو وہ صانع ہی نہیں ہو سکتا۔ اس قاعدہ کی بنا پر یہ ماننا ضروری ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے اس سب کا خدا کو پہلے سے علم تھا اور اس کے پیش آنے کا خدا نے ارادہ کیا تھا۔ اب اگر خدا کو یہ علم تھا کہ فلاں شخص فلاں وقت فلاں فعل کرے گا، تو اس فعل کا اس وقت اس شخص سے واقع ہونا واجب ہے، کیونکہ اگر وہ واقع نہ ہو تو خدا کا علم جہل ہوگا، اور یہ محال ہے۔ اسی طرح اگر خدا نے یہ ارادہ کیا تھا کہ فلاں وقت فلاں شخص سے فلاں حرکت سرزد ہو تو اس کا ارادہ پورا ہونا واجب ہے، ورنہ ارادۂ الٰہی کا باطل ہونا لازم آتا ہے۔ اس استدلال سے جبریہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ فعلِ اختیاری بجز واجب الوجود کے کسی اور میں متحقق نہیں ہے، باقی جتنے مختار ہیں سب کے سب مضطر بصورت مختار ہیں۔ قدریہ کا اس پر بھی وہی اعتراض ہے کہ اس سے خدا کا فاعلِ خیر و شر ہونا لازم آتا ہے، انسان کی تمام برائیوں کی ذمہ داری خدا کی طرف راجع ہوتی ہے اور اس اعتبار سے انسان، حیوان، جمادات اور نباتات میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔

لیکن جتنا یہ اعتراض وزنی ہے، اتنا ہی بلکہ اس سے زیادہ وہ اشکال وزنی ہے جو جبریہ نے علمِ الٰہی اور ارادۂ الٰہی کے بارے میں پیش کیا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ انسان کے اختیار کو نباہنا اور اس وجوب و لزوم سے، جو خدا کے علیم و مرید ہونے کا منطقی نتیجہ ہے، انسان کی آزادی کو بچا لیجانا نہایت مشکل ہے۔ قدریہ نے اس اشکال سے بچنے کے لئے جو راہیں اختیار کی ہیں ان میں سے اکثر اس سے زیادہ تشنیع الزامات کو مستلزم ہیں جو وہ جبریہ پر عائد کرتے ہیں۔ مثلاً ان میں سے بعض نے خدا کے علیم و مرید ہونے ہی سے انکار کر دیا ہے، بعض نے علم و ارادۂ الٰہی کو تسلیم کر لیا ہے، مگر وہ اس کو جزئیاتِ تفصیلات سے متعلق نہیں کرتے بلکہ اجمال پر محمول کرتے ہیں[1]۔ بعض کہتے ہیں کہ خدا نے جو قوتیں انسان کو عطا کیں ان سے وہ صرف خیر کا ارادہ رکھتا تھا اور اسے یہ علم نہ تھا کہ ان کا غلط استعمال کیا جائے گا۔ لیکن یہ ایسی

---

[1] یعنی کہتے ہیں کہ خدا کو جزئیات کا علم نہیں ہے بلکہ وہ صرف کلیات کو جانتا ہے۔

ضعیف باتیں ہیں جن کے ابطال کے لئے زیادہ نظر و تامل کی ضرورت نہیں ہے۔

زیادہ سے زیادہ قوی دلیل جو جبریہ کے جواب میں قدریہ کی طرف سے پیش کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ خدا کے علمِ سابق اور انسان کی آزادی میں بظاہر خواہ کتنی ہی منافات نظر آتی ہو، لیکن حقیقت میں مستقبل کے کسی واقعہ کے متعلق کسی کے علم کی صحت سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ علم ہی اس واقعہ کی علت ہو۔ اگر ہم موسم کے متعلق کوئی حکم لگائیں کہ فلاں وقت بارش ہوگی اور یہ حکم صحیح نکلے تو نہیں کہا جاسکتا کہ بارش کے متعلق ہمارا علم ہی بارش کی علت ہے۔ مگر یہ دلیل جتنی قوی نظر آتی ہے درحقیقت اتنی قوی نہیں ہے اس لئے کہ حقیقی علمِ سابق اور ظن و قیاس دو الگ الگ چیزیں ہیں ظن و قیاس کی صحت کو مظنون کے وقوع میں بلاشبہ کوئی دخل نہیں ہے، لیکن حقیقی علمِ سابق اور معلوم کے درمیان وجوب و لزوم کے تعلق کی نفی کرنا بہت مشکل ہے۔

ان اصولی اشکالات کے علاوہ متعدد فروعی اشکالات اور بھی ہیں جو مابعد الطبیعیات میں جبریت و قدریت دونوں کو پیش آتے ہیں لیکن دونوں کی مشکلات یکساں نہیں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جبریت نے انسان سے ارادہ کی آزادی سلب کرکے اُس شے کی نفی کی ہے جس کا ثبوت ہم اپنے نفس میں اوّلی اور وجدانی طور پر پاتے ہیں مگر قدریت نے جو مذہب اختیار کیا ہے وہ تو اس سے بھی زیادہ برا ہے کیونکہ وہ یا تو خدا سے علم، ارادہ اور قدرت جیسی صفات کمالیہ کو سلب کرکے انسان کو اس سے متصف کرتی ہے یا سرے سے خدا یا علت العلل یا صانع کائنات کے وجود ہی کا انکار کرتی ہے۔ اور ان دونوں صورتوں میں جن محالات لازم آتے ہیں جن کا ارتکاب فلسفہ و منطق کے قانون میں اوّلیات و وجدانیات کے انکار سے بہت زیادہ شنیع بلکہ اشنع ہے یہی وجہ ہے کہ مابعد الطبیعیات کے حدود میں قدریت کو قدم جمانے کے لئے کوئی مضبوط بنیاد نہیں مل سکی ہے اور دہریوں کی ایک قلیل جماعت کو چھوڑ کر فلاسفہ کی عظیم اکثریت نے جبر کا پہلو اختیار کیا ہے قدما میں انکسماندر (Anaximander) افلاطون اور اکثر رواقیہ (Stoics.) مذہب جبر کے حامی تھے۔

فلاسفۂ اسلام کی عظیم اکثریت نے بھی اس مذہب کی حمایت کی ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کا سب سے بڑا فلسفی ابن سینا تعلیقات شفا میں لکھتا ہے :-

"عرف عام میں مختار سے مراد بالقوت مختار ہے، اور بالقوت مختار ہمیشہ ایک ایسے مرجح کا محتاج ہوتا ہے جو اس کے اختیارات کو قوت سے فعل میں لائے، عام اس سے کہ وہ مرجح خود اس کی ذات میں ہو یا اس سے خارج۔ اس بنا پر ہم میں جو مختار ہے وہ دراصل مضطر کے حکم میں ہے۔"

یہی حال یورپین فلاسفہ کا بھی ہے۔ پومپونیزی (Pomponazzi) صریح حکم لگاتا ہے کہ خدا فاعل خیر و شر ہے اور عقل کلیتہً جبر کا فیصلہ کرتی ہے۔ ہابز (Hobbes) کہتا ہے کہ انسان اپنی فطرت اور طبیعی داعیات کے ہاتھوں مجبور محض ہے۔ ڈیکارٹ (Descartes) جو نفس اور جسم، یا روح و مادہ کی دوئی کا قائل ہے، مادی دنیا میں قانون جبر کے سوا کوئی قانون نہیں دیکھتا۔ اس کے نزدیک انسان سمیت تمام عالم ایک مشین کی طرح کام کر رہا ہے۔ اگرچہ اس کے ساتھ ہی وہ نفس میں کامل خود اختیاری کی قوت کا اثبات بھی کرتا ہے مگر اس کے مذہب کا منطقی نتیجہ جبری ہے۔ چنانچہ مذہب کارٹیزی (Cartesian School) کے دوسرے ائمہ جن میں میلبرانش (Malebranche) سب سے زیادہ نمایاں ہے، صاف کہتے ہیں کہ نفس کے ہر ارادہ کے ساتھ خدا جسم میں حرکت پیدا کرتا ہے اور جسم کے ہر تہیج کے ساتھ نفس میں ادراک خلق کرتا ہے، مادہ و روح یا امتداد و فکر کے درمیان خدا کا توسط لازمی ہے، کیونکہ ایک واسطہ کے بغیر ان دونوں مستقل جوہروں میں تعامل متصور نہیں ہو سکتا، لہٰذا خدا ہی تمام ارادات و حرکات کا حقیقی فاعل ہے۔ اسپائنوزا (Spinoza) کے نزدیک انسان اپنے اندر خواہ کتنی ہی فعلیت محسوس کرتا ہو مگر دراصل وہ فاعل نہیں بلکہ منفعل ہے، اس لئے وہ بالکل بے قدرت ہے۔ اس کے خیال میں یہی جبریت ایک فلسفی کے لئے مسرت و اطمینان قلب کا سرچشمہ ہے۔ لائبنٹز (Leibnitz) کے احاد یا فردات (Monads) اگرچہ بجائے خود آزاد ہیں مگر ان میں توافق از (Pre.established harmony) خدا کا پیدا کیا ہوا ہے، اس لئے

وہ بھی آخر کار جبری ہی کی طرف آجاتا ہے۔ بلکہ اس کی جبریت کو ہم جبریتِ خالصہ کہہ سکتے ہیں۔ لاک (Locke) آزادی ارادہ کو بے معنی، اور اُس قدریت کو جس کے آثار ڈیکارٹ کے فلسفہ میں پائے جاتے ہیں، غلط قرار دیتا ہے۔ اگرچہ وہ صاف طور پر جبریت کا اقرار نہیں کرتا، مگر جب وہ یہ کہتا ہے کہ ہم ارادہ کرنے یا نہ کرنے کے لئے آزاد نہیں ہیں، اور یہ کہ ارادہ نفس سے معیّن ہوتا ہے اور نفس خواہش مسرت ہے، تو اس کے فلسفہ کا رخ قدریت سے جبریت کی طرف پھر جاتا ہے۔ شاپنہار (Schopenhaur) جس ارادہ کو انسان سے لے کر جمادات تک سب چیزوں میں کارفرما دیکھتا ہے وہ ہرگز وہ ارادہ نہیں ہے جس کی آزادی پر قدریت کی بنیاد قائم ہے۔

اس میں شک نہیں کہ کانٹ (Kant) فشتے (Fischte) اور ہیگل (Hegel) جیسے اکابر فلسفہ نے قدریت کی طرف میلان ظاہر کیا ہے، سقراط نے آزادی ارادہ کی حمایت کی ہے، افلاطون نے انسان کے لئے اختیار ثابت کیا ہے، ارسطو نے اختیاری اور اضطراری افعال میں تمیز کر کے انسان کو ایک حد تک آزاد اور ایک حد تک مجبور قرار دیا ہے، خریسی فوس رواقی (Chrysippuz) نے جبریت اور اخلاقی ذمہ داری میں توافق پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، اور فلاسفہ اسلام میں سے ایک گروہ نے لاجبر ولا تفویض ولکن امر بین الامرین کا مذہب اختیار کیا ہے۔ مگر یہ سب کچھ حکمتِ نظری کی خاطر نہیں بلکہ حکمتِ عملی کی خاطر ہے۔ ورنہ جہاں تک خالص مابعد الطبیعی نقطۂ نظر کا تعلق ہے، اس کی رو سے جبریت کا پلڑا قدریت کی بہ نسبت بہت زیادہ جھکا ہوا ہے، اور فلاسفہ کا اختلاف زیادہ تر جبریت اور قدریت کے اختلاف کی طرف نہیں بلکہ جبریتِ خالصہ اور جبریتِ متوسطہ کے اختلاف کی طرف راجع ہوتا ہے۔

فلسفہ کی ناکامی

لیکن اس بحث میں قدریت کی بہ نسبت جبریت کا پلڑا جھک جانے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ فلسفہ نے اس گتھی کو سلجھا لیا اور مسئلہ جبر کے حق میں طے ہو گیا۔ بلکہ اس سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسان جب زیادہ گہری نگاہ سے ملکوتِ ارض و سموات کو دیکھتا ہے، اور اس مطالعہ کی مدد سے اس زبردست نظام کے چلانے والے کی صفات کا تصور کرتا ہے، تو اکثر و بیشتر اس کے دل و دماغ پر ایسی دہشت

طاری ہو جاتی ہے کہ اس کی نگاہ میں خود اپنی ہستی کی کوئی منزلت باقی نہیں رہتی، اور اس کی مدہوش عقل اس سے کہتی ہے کہ جس کی قدرت اس لامحدود کائنات کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہے، جس کا ارادہ اتنی عظیم الشان سلطنت پر فرمانروائی کر رہا ہے، جس کا علم اس نظام وجود کے چھوٹے اور بڑے سب کل پرزوں اور ان کی حرکات و سکنات پر ازل سے لے کر ابد تک حاوی ہے، اُس کے سامنے تو بالکل عاجز ہے، بے بس ہے، درماندہ ہے، تیری قدرت، تیرا علم، تیرا ارادہ کوئی چیز نہیں۔

اس سے بڑھکر اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ فلسفے نے قضا و قدر کے مسئلہ کو سمجھ لیا ہے تو وہ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ قضا و قدر کا سوال حقیقت میں یہ سوال ہے کہ خداوند عالم کی سلطنت کا دستور اساسی کیا ہے؟ خدا کے علم اور اس کی معلومات، خدا کی قدرت اور اُس کے مقدورات، خدا کے ارادہ اور اس کے مرادات کے درمیان کس قسم کا علاقہ ہے؟ خدا کا حکم کیا معنی رکھتا ہے؟ کس طرح وہ اُسکی مخلوقات میں نافذ ہوتا ہے؟ مخلوقات کے مختلف مراتب میں اس کے احکام کی تنفیذ کن ضوابط کے تحت ہوتی ہے؟ اور موجوداتِ عالم کی بے شمار انواع میں سے ہر نوع کس حیثیت سے اُس کی تابع فرمان ہے؟ اب اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے ان سوالات کو حل کر لیا ہے تو دوسرے الفاظ میں اس کا دعویٰ یہ ہے کہ اس نے خدا اور اُس کی پوری خدائی کو ناپ ڈالا ہے یہ اُن تمام باتوں سے زیادہ شنیع بات ہے جن کا الزام قدریہ اور جبریہ ایک دوسرے پر عائد کرتے ہیں۔ اور اگر ان کا دعویٰ یہ نہیں ہے تو محض قیاس و استدلال کے بل بوتے پر وہ علم و یقین کے ایسے مرتبہ تک کیونکر پہنچ سکتے ہیں جہاں قطعیت کے ساتھ جبر یا قدر کا حکم لگانا ان کے لئے ممکن ہو؟

طبیعی نقطۂ نظر

طبیعیات میں یہ مسئلہ اس پہلو سے آتا ہے کہ تمام کائنات کی طرح انسان کے افعال بھی سلسلۂ اسباب سے وابستہ ہیں، اور اُس سے جو کچھ بھی صادر ہوتا ہے کسی سبب یا متعدد اسباب کے اثر سے ہوتا ہے۔ ایک فعل کے وجود میں آنے کے لئے جن اسباب کی ضرورت ہے اگر وہ جمع نہ ہوں تو فعل کا وجود میں آنا ممتنع ہے، اور اگر جمع ہو جائیں تو اس کا وجود میں آنا واجب ہے۔ ان دونوں صورتوں میں انسان مجبورِ محض ہے۔ اس لحاظ سے طبیعیات کا میلان ہمیشہ سے جبریت کی طرف رہا ہے۔ چنانچہ مادیین کا ابوالآبا، دیمقراطیس (Democritus) جسے قدمائے طبیعیین میں ایک ممتاز حیثیت حاصل ہے، اب سے ڈھائی ہزار برس پہلے صاف کہہ چکا ہے کہ عالم کی تمام اشیاء قانونِ فطرت میں جکڑی ہوئی ہیں۔

تاہم جب تک طبیعیین نے نفس اور مادہ کے جوہری اختلاف سے انکار نہیں کیا تھا اور جب تک وہ قوائے نفسیہ کو عالم مادہ سے کسی نہ کسی حد تک ماوراء سمجھتے تھے، اس وقت تک قدریت کے لئے طبیعیات میں کچھ نہ کچھ گنجائش نکل سکتی تھی، لیکن جب اٹھارویں صدی کے آغاز سے علوم طبیعیہ نے غیر معمولی ترقی کی، اور سائنس کی دنیا میں تحقیق و اکتشاف کے نئے نئے دروازے کھلنے لگے تو نفس اور روح اپنی تمام قوتوں سمیت ترکیب مادی اور مادہ کے کیمیاوی امتزاجات کا نتیجہ قرار دے دئے گئے، اور انسان ایک نفسانی و روحانی وجود کے بجائے محض ایک مشینی وجود رہ گیا۔ اس طرح طبیعیات کے حدود سے قدریت یک بینی و دوگوش خارج کردی گئی اور سائنس نے اپنا پورا وزن جبر کے پلڑے میں رکھ دیا۔

علم الحیات (Biology.) اور علم وظائف الاعضاء (Rhysiology) کی جدید تحقیقات

جن کی بدولت علم النفس اب قریب قریب انہی دونوں علوم کی شاخ بن گیا ہے، یہ حکم لگا رہی ہیں کہ دماغ کی شکل اور اس کی ساخت، اور جرم دماغی و نظامِ عصبی کی کیفیت ہی پر انسان کی فطرتِ جبلیہ کا مدار ہے۔ اسی کی خرابی سے انسان کی فطرت خراب ہوتی ہے اور اس سے بُرے رجحانات اور بُرے اعمال کا ظہور ہوتا ہے، اور اسی کی بہتری سے اس کی فطرت اچھی ہوتی ہے اور وہ اچھے میلانات اور نیک اعمال کا مظہر و مصدر بنتا ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جرمِ دماغی اور نظامِ عصبی کی ساخت میں انسان کے آزاد ارادہ کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اس لئے اس مادی نظریہ کو تسلیم کر لینے کے بعد یہ ماننا لازم ہو جاتا ہے کہ انسان کے اندر سرے سے آزادی کا کوئی عنصر ہے ہی نہیں جس طرح لوہے کی مشین ایک لگے بندھے اصول پر کام کرتی ہے، اسی طرح انسان بھی طبیعت کے ایک زبردست قانون کے تحت کام کر رہا ہے اخلاق کی زبان میں جس چیز کو ہم نیکی اور حسنِ سیرت سے تعبیر کرتے ہیں، سائنس کی زبان میں وہ محض عناصر جسمانی کی ترکیب صحیح اور نظامِ عصبی کی درست حالت ہے۔ اخلاق جسے بدی اور بدچلنی سے تعبیر کرتا ہے۔ سائنس اس کو جرمِ دماغی اور نظامِ عصبی کا سقم قرار دیتا ہے۔ اس لحاظ سے نیکی اور صحت، بدی اور بیماری میں کوئی فرق نہیں رہتا جس طرح ایک شخص اپنی اچھی صحت کے لئے مدح اور بیماری کے لئے ذم کا مستحق نہیں ہے اسی طرح اپنی بدچلنی یا نیک چلنی کے لئے بھی وہ مدح یا ذم کا مستحق نہ ہونا چاہئے۔

Law of Heredity
اس کے ساتھ ایک دوسرا زبردست قانون جو جبریت کی تائید کرتا ہے قانونِ توریث ہے جس کی بنیادوں کو ڈارون اور رسل ولیس (Russel wallace) اور ان کے متبعین نے استوار کیا ہے۔ اس کی رو سے ہر شخص کی فطرت و سیرت اسی سانچے میں ڈھلتی ہے جو زمانہ ہائے ماسبق سے نسلاً بعد نسل چلا آ رہا ہے، اور یہ موروثی سانچہ جس شکل میں فطرت و سیرت کو ڈھالتا ہے اس کو بدل دینے پر کوئی شخص قادر نہیں ہے۔ اس لحاظ سے آج ایک شخص سے جو بُرائی ظاہر ہوتی ہے وہ گویا ایک پھل ہے اس بُرے بیج کا جو اب سے سو برس پہلے اس کے پردادا نے بویا تھا، اور اس پردادا میں جو بُرائی تھی

وہ بھی اس کو اپنی گذشتہ نسلوں سے ملی تھی۔ اس پھل کے ظہور و عدم ظہور میں اس شخص کے ارادہ و اختیار کو کچھ بھی دخل نہیں ہے، بلکہ وہ اسی طرح اس کے اظہار پر مجبور ہے۔ جس طرح ایک آم کا درخت، جو ایک کھٹے آم کی گٹھلی سے اُگا ہے، کھٹا آم پیدا کرنے پر مجبور ہے۔

تاریخ کا نظریہ بھی جبر ہی کا مؤید ہے۔ اس کی رو سے اسباب خارجی کی تاثیرات مجموعی حیثیت سے اُس بڑی انسانی جماعت کی طرز و سیرت کو متاثر کرتی ہیں جو اُن اسباب کے تحت رہتی ہو اور اسی بنا پر ایک مجموعہ اسباب کے ماتحت رہنے والی قوم کے خصائص کسی دوسرے مجموعہ اسباب کے زیر اثر رہنے والی قوم کے خصائص سے مختلف ہوتے ہیں اگر ہم عمیق نگاہ سے دیکھیں تو دو قوموں کے اختلاف مزاج اور اختلاف سیرت کا مرجع اُن اسباب خارجی کے اختلاف کو قرار دے سکتے ہیں جن کے تحت ان دونوں نے نشو و نما پایا ہو۔ اسی طرح اگر ہم اسباب خارجی کی روشنی میں کسی قوم کے خصائص کو اچھی طرح سمجھ لیں تو پوری صحت کے ساتھ پیش گوئی کر سکتے ہیں کہ وہ کن حالات میں کیا روش اختیار کرے گی۔ فرد کے شخصی ارادہ و اختیار کے لئے اس ہمہ گیر قانون کی مقرر کی ہوئی راہ سے انحراف کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اگر افراد کی شخصی آزادی تسلیم کر لی جائے تو اس زبردست تشابہ کی کوئی توجیہ نہیں کی جا سکتی جو صدیوں تک ایک قوم کے اعمال و افعال میں دیکھا جاتا ہے، کیونکہ یہ کسی طرح تصور نہیں کیا جا سکتا کہ قوم کے تمام افراد نے متفق ہو کر بالارادہ ایک جیسے اعمال کرتے رہنے کا فیصلہ کیا ہو

اعداد و شمار کے فن نے بھی تجربی بنیاد پر جبر کی حمایت کی ہے۔ بڑی بڑی آبادیوں کے متعلق مختلف حالات میں جو اعداد و شمار فراہم کئے گئے ہیں، انھیں جب اُن خارجی اسباب کی روشنی میں دیکھا گیا جن کے تحت وہ حالات پیش آئے تھے، تو معلوم ہوا کہ ہر جماعت میں مخصوص اسباب کے اثر سے مخصوص حالات پیش آتے ہیں، اور ان حالات میں کثیر افراد کے اعمال بالکل ایک دوسرے سے مشابہ ہوتے ہیں۔ اس قسم کے تجربات سے اب یہ علم اس حد تک ترقی کر چکا ہے کہ ایک ماہر فن ایک بڑی آبادی کے متعلق قریب قریب پوری صحت کے ساتھ یہ حکم لگا سکتا ہے کہ وہ فلاں قسم کے حالات میں فلاں عمل کرے گی۔ و

کہہ سکتا ہے کہ ایک سال کے اندر شہر لندن میں کتنی خودکشیاں ہوں گی۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ ایک سال کے اندر شہر شکاگو میں کتنی چوریاں ہوں گی۔ اگر ایک ملک میں دوسرے ملک کی بہ نسبت قتل کے اعداد و شمار کا تناسب زیادہ ہو تو وہ قریب قریب صحت کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ اس کے معاشی یا عمرانی یا طبعی اسباب یہ ہیں۔ ایک ملک یا ایک بڑی آبادی میں جس طرح اموات، پیدائش، جرائم اور دوسرے واقعات کا اوسط سالہا سال تک یکسانی کے ساتھ چلتا رہتا ہے، اور جس طرح اجتماعی حالات کے تغیر و تبدل سے اِن اعداد و شمار میں اُتار چڑھاؤ ہوا کرتا ہے، اس کی توجیہ بجز اس کے اور کسی چیز سے نہیں کی جاسکتی کہ اسباب خارجی کی تاثیرات بڑی بڑی آبادیوں پر اس ہمہ گیری اور اس قوت کے ساتھ عمل کرتی ہیں کہ افراد کے شخصی ارادے اُن کے خلاف چل نہیں سکتے۔

سائنس کی ناکامی

اس مختصر بیان سے واضح ہو گیا کہ وہی سائنس جس پر انسان نے اپنے تفوق اور اپنے افتخار کی بنیاد رکھی ہے، کس طرح اس کی تمام فکری بلند پروازیوں اور تحقیق و انکشاف کی عقدہ کشائیوں کا سرمایۂ فخر و ناز اُس سے چھین لیتا ہے، اور کس طرح انسان خود اپنے علم، اپنی فکر اور اپنی تحقیق کی بنا پر اپنے آپ کو نباتات و جمادات اور بے جان مشینوں کی طرح ایک مضطر و بے اختیار ہستی تسلیم کر لیتا ہے۔ مگر اس تسلیم و اعتراف کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ سائنس نے قضا و قدر کے مسئلے کو واقعی حل کر لیا ہے۔ برعکس اس کے اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ سائنس اُس اختیار، قدرت اور آزادیِ ارادہ کی کوئی توجیہ نہیں کر سکا جس کو وجدانی طور پر ہم اپنے اندر محسوس کرتے ہیں، جس کے آثار شب و روز ہمارے مشاہدے میں آتے ہیں، اور جس کی بنا پر ہم ارادی و اضطراری اعمال میں ہمیشہ فرق کیا کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ خود نفس، جس کے وجود پر انسان کا مختار اور صاحب ارادہ ہونا موقوف ہے، سائنس کی تحقیقات سے بالاتر ثابت ہوا ہے اور کوئی سائنٹیفک طریقِ تفتیش ابھی تک اُس شے کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکا ہے جو انسان کے مادی وجود میں ایسے آثار و افعال اور اوصاف و خواص کا مبدا بنتی ہے جن کو کسی مادی ترکیب اور

کسی کیمیاوی امتزاج کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا۔

بہر حال اگر عالمِ طبیعی یہ کہے کہ انسان کی سیرت میں اس کے نظام عصبی اور جرم دماغی کی ساخت کو بہت کچھ دخل حاصل ہے تو اس کو تسلیم کیا جاسکتا ہے، لیکن اس کا یہ دعویٰ تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ جسمانی خصائص، نفسانی خصائص کی واحد علت ہیں۔ اسی طرح اگر نظریۂ ارتقاء کا پیرو یہ کہے کہ انسان اپنی بہت سی خصوصیات وراثۃً حاصل کرتا ہے تو اس کو تسلیم کرنے میں کوئی قباحت نہیں، لیکن اگر وہ یہ کہے کہ انسان میں سب کچھ موروثی ہی ہے اور اس کے پاس اپنا کچھ بھی نہیں، تو دوسرے حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم اس دعوے کو کسی طرح قبول نہیں کرسکتے۔ اسی طرح تاریخ اور اعداد و شمار کی بنا پر جو نظریہ قائم کیا گیا ہے اس کی صحت بھی بس اسی حد تک ہے کہ شخص انسانی کو ایک بڑی حد تک اُن خارجی تاثیرات نے مجبور کر رکھا ہے جو وسیع پیمانے پر قوموں اور جماعتوں کو متاثر کرتی ہیں، لیکن اس سے یہ ثابت کرنا ممکن نہیں ہے کہ اجتماعی احوال کی گردش میں افراد کے شخصی ارادوں کو کسی قسم کی آزادی حاصل ہی نہیں ہے۔ اور اجتماعی زندگی کی مشین میں اشخاص محض بے جان کل پرزوں کی طرح حرکت کر رہے ہیں۔

پس علومِ طبیعی اور ان کے توابع درحقیقت مسئلۂ جبر و قدر کا تصفیہ نہیں کرتے بلکہ ہم کو مشاہدات و تجربات کی بنا پر صرف یہ بتاتے ہیں کہ ہماری زندگی میں جبر کے حدود کہاں تک وسیع ہیں۔

اخلاقی نقطۂ نظر

خالص اخلاقیات کے دائرے میں انسان کے مجبور یا مختار ہونے کا سوال اس حیثیت سے نہیں آتا کہ ظاہری حالات کی تہ میں باطنی حقیقت کیا ہے، بلکہ یہاں اس پر اس نقطۂ نظر سے بحث کی جاتی ہے کہ انسان کی سیرت اور اس کے کردار پر حسن و قبح کا حکم، اور اس کے اچھے اور بُرے رویہ پر مدح و ذم کا استحقاق، اور اس کے نیک و بد اعمال پر جزا و سزا کا فیصلہ کس بنیاد پر ہے۔ اوّل نظر میں معلوم ہوتا ہے کہ یہاں قدریہ کا پلہ بھاری ہے اور جبریت کی شکست یقینی۔ کیونکہ اگر انسان کو مجبور محض تسلیم کر لیا جائے اور یہ مان لیا جائے کہ جو کچھ وہ کرتا ہے اپنے ارادہ و اختیار سے نہیں کرتا، تو سرے سے اس کی ذمہ داری کا تصوّر ہی باطل ہو جاتا ہے۔ نیکی اور بدی بے معنی ہو جاتی ہے۔ اچھے اور بُرے کا کوئی مفہوم نہیں رہتا۔ نہ کوئی بڑے سے بڑا نیکوکار تعریف کا مستحق رہتا ہے اور نہ بدتر سے بدتر گنہگار مذمت کا۔ نہ کوئی اچھے سے اچھا خادمِ خلق انعام کا مستوجب رہتا ہے اور نہ سخت سے سخت مجرم سزا کا۔ ہماری عدالتیں، ہمارے قوانین، ہماری پولیس، ہمارے جیل خانے، ہمارے مدرسے، ہماری اخلاقی تربیت گاہیں، ہمارے وعظ، ہماری تقریریں، ہماری تحریریں، غرض وہ تمام چیزیں جو انسان کو صاحبِ ارادہ اور صاحبِ اختیار فرض کر کے اصلاح، تعزیر، عبرت، اور موعظت کے لئے قائم کی گئی ہیں قطعاً بیکار اور لاحاصل قرار پاتی ہیں۔

لیکن بحث و تحقیق کے میدان میں دو چار قدم آگے بڑھتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں جبریت اور قدریت کے اختلاف کا فیصلہ صرف اتنی سی بات پر نہیں ہو جاتا۔ اخلاقیات میں عمل کی قدر و قیمت سیرت اور محرکاتِ عمل کی بنیاد پر جانچی جاتی ہے۔ اور سیرت و محرکات کا سوال آتے ہی یہ ناگزیر ہو جاتا ہے کہ اُن عناصر کی تحقیق کی جائے جن سے انسان کی سیرت بنتی ہے اور اُن اندرونی عوامل کا پتہ چلایا جائے جو

کردار، عمل کی صورت میں ظہور کرتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر بحث کا رخ پھر طبیعیات، نفسیات اور مابعد الطبیعیات کے مسائل کی طرف پھر جاتا ہے۔

قائلین جبر کہتے ہیں کہ انسان کی سیرت دو زبردست عنصروں سے بنی ہے۔ ایک فطرتِ اصلیہ جس کو لے کر وہ پیدا ہوتا ہے، دوسرے خارجی تاثرات جن سے وہ ہر لحظہ متاثر ہوتا ہے اور جن کے سانچے میں ہر آن ڈھلتا رہتا ہے۔ پہلی چیز تو قطعاً وہبی ہے جس میں انسان کے اختیار کو دخل نہیں ہے۔ ایک شخص ماں کے پیٹ سے جو فطرت لے کر پیدا ہوتا ہے وہی اس کی سیرت کا مایۂ خمیر ہوتی ہے۔ بُری فطرت سے اچھے اعمال کا ظہور ممکن نہیں ہے اور اچھی فطرت سے بُرے اعمال کا ظہور بھی غیر ممکن ہے۔ رہیں خارجی تاثیرات جن میں طبیعی اور اجتماعی دونوں قسم کی تاثیریں شامل ہیں، تو وہ فطرت کے اس اصلی مادے کو پرورش کرتی ہیں اور اس کی قابلیت و استعداد کے مطابق اس کو ایک خاص شکل میں متشکل کر دیتی ہیں۔ ایک اچھی فطرت کا انسان اچھے ماحول میں ولی بن جاتا ہے اور بُری فطرت کا انسان بُرے ماحول میں شیطان۔ اسی طرح بُرا ماحول اچھی فطرت کی خوبیوں کو کم کر دیتا ہے اور اچھا ماحول بُری فطرت کی خرابیوں کو گھٹا دیتا ہے۔ فطرت اور ماحول کا تعلق بالکل ایسا ہی ہے جیسے بیج کا تعلق زمین، پانی، آب و ہوا، اور طریقِ باغبانی سے۔ درخت کا اصل مادہ بیج ہے، اور ان خارجی اشیاء پر اُس کے اچھی طرح یا بُری طرح بارآور ہونے کا انحصار ہے۔ یہی حال انسان کا بھی ہے وہ ان دونوں قوتوں کے ہاتھوں مجبور ہے۔ نہ وہ اپنی فطرت کو بدل سکتا ہے، نہ اپنے انتخاب سے خارجی ماحول کو اختیار کرتا ہے، اور نہ ماحول کی تاثیرات سے متاثر ہونا یا نہ ہونا اس کے اختیار میں ہے۔

قدریہ میں سے انتہا پسند گروہ تو اس کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک فطرتِ اصلیہ اور ماحول کی تاثیرات کو اگر انسان کے کردار میں کوئی دخل ہے تو وہ صرف اضطراری اعمال کی حد تک ہے۔ رہے وہ اعمال جن کو انسان سوچ سمجھ کر، اپنی قوتِ تمیز اور قوتِ فیصلہ سے کام لے کر، بالارادہ کرتا ہے، تو ان میں دونوں کو کسی قسم کا دخل حاصل نہیں ہے، بلکہ وہ قطعاً اس کے اپنے اختیار کا نتیجہ ہیں۔ یہ خالص قدریت ہے

جس کو بعض لوگوں نے پیش کیا ہے۔ مگر اس نظریہ کو قبول کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ شعور، عقل و فہم، قوتِ تمیز اور قوتِ فیصلہ، جو آدمی کے اختیاری افعال کی بنیاد ہیں، خود ہی وہبی ہیں۔ نہ انسان نے اپنے کسب سے ان کو حاصل کیا ہے اور نہ وہ ان میں بال برابر کمی و بیشی کرنے پر قادر ہے۔ پھر ان قوتوں کے اثر سے وہ اپنے لئے عمل کی جو راہ بھی اختیار کرے، اُس کے متعلق کیسے کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس کے آزادانہ اختیار کا نتیجہ ہے۔

متوسطینِ قدریہ کا مذہب اس معاملہ میں یہ ہے کہ بلاشبہ انسان کی سیرت میں فطرتِ اصلیہ اور خارجی تاثیرات کو بہت کچھ دخل حاصل ہے، انسان اچھے اور بُرے میلانات اور نیکی و بدی کی استعدادات لے کر پیدا ہوتا ہے، اور طبیعی اور اجتماعی ماحول کے سانچے میں ڈھل کر اس کی سیرت ایک خاص شکل اختیار کر لیتی ہے لیکن ان دونوں کے علاوہ ایک تیسری چیز بھی ہے جو اس کے کردار میں دخل رکھتی ہے، اور وہ ہے انسان کا غیر مقدر اختیار۔ ہم انسان کی نیکی اور بدی کے متعلق جو احکام لگاتے ہیں وہ اس کی پیدائشی فطرت یا اس کے طبیعی و اجتماعی ماحول کی بنا پر نہیں ہوتے، بلکہ اسی غیر مقدر اختیار کی بنا پر ہوتے ہیں جہاں تک پہلی دونوں چیزوں کا تعلق ہے، اُن کے لحاظ سے انسان مجبور ہے اور اس کے کردار کا جو حصہ ان کے زیر اثر ہے وہ اخلاقی نقطۂ نظر سے بالکل بے قیمت ہے۔ دراصل اخلاقی قدر و قیمت اور نیک و بد کے احکام جس چیز پر مترتب ہوتے ہیں وہ صرف تیسری چیز ہے، یعنی انسان کا غیر مقدر اختیار۔

نظریہ کی حد تک یہ بات بہت معقول ہے۔ لیکن اصلی دقت یہ ہے کہ ہمارے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں جس سے ہم انسان کے کردار میں فطرتِ اصلیہ، خارجی ماحول، اور غیر مقدر اختیار کے حصے الگ الگ متعین کر سکیں اور اپنے اخلاقی احکام کو صرف تیسرے حصے کی حد تک محدود رکھیں۔ اگر اخلاقی قدر و قیمت کا انحصار صرف اسی عنصر کی مقدار پر ہو تو ہمارے لئے کسی شخص کے متعلق نیک یا بد ہونے کا حکم لگانا قطعاً ناممکن ہے کسی آلہ سے ناپ کر، کسی ترازو سے تول کر، کسی طریقِ تحلیل سے تجزیہ کر کے ہم یہ معلوم نہیں کر سکتے کہ ایک نیک آدمی کس حد تک پیدائشی نیک ہے، کس حد تک ماحول کا بنایا ہوا نیک ہے، اور کس حد تک اپنے غیر مقدر اختیار کی بنا پر

نیک ہے۔ اور اسی طرح ایک برا آدمی کہاں تک مجبوراً برا ہے اور کہاں تک بالارادہ و بالاختیار برا۔ پس قدریت کے اس نظریہ کو تسلیم کرنے سے ہمارے تمام اخلاقی احکام معطل ہو جاتے ہیں، اور وہ محض معطل ہی نہیں ہوتے بلکہ اس کے بعد تو ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم اپنے تعزیری قوانین منسوخ کر دیں، اپنی عدالتوں کو برخاست کر دیں اور جیل خانوں کو توڑ ڈالیں۔ کیونکہ جن مجرموں کو ہم پکڑتے ہیں اور جن پر ہمارے جج سزا کے فیصلے صادر کرتے ہیں اور جن کو ہم جیل خانوں میں ٹھونس دیتے ہیں ان کے متعلق ہمارے بڑے بڑے فاضل جج کو بھی یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ان کے جرم میں ان کے اپنے غیر مقدر اختیار کا کس حد تک دخل ہوتا ہے، اور جب یہ بنیادی چیز ہی غیر معلوم ہے تو کسی طرح ممکن نہیں کہ سزا کی مقدار مجرم کے اختیار کی مقدار کے مطابق ہو۔

اس مرحلے پر قدریت ایک ایسی سرزمین میں پہنچ جاتی ہے جہاں اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ وہ راستہ ٹٹول ٹٹول کر چلنے کی خواہ کتنی ہی کوشش کرے، مگر چند قدم بھی ٹھوکروں اور لغزشوں سے بچ کر نہیں چل سکتی۔ آخر وہ پلٹ کر جبریت سے کہتی ہے کہ اگر میرے نظریہ سے اخلاقی احکام معطل ہو جاتے ہیں اور عدالت کا نظام نہیں چل سکتا تو یہی بلکہ اس سے بھی زیادہ برا نتیجہ تیرے نظریہ سے بھی حاصل ہوتا ہے۔ تیرے نظریہ کی رو سے تو انسان اپنے کسی فعل کا ذمہ دار ہی نہیں ہے، پھر حسن و قبح کے احکام کس بنا پر؟ مدح یا ذم کس چیز کی؟ سزا و تعزیر کے فیصلے کس وجہ سے؟ ایک غیر ذمہ دار آدمی کا نیک و بد ہونا تو ایسا ہی ہے جیسے کسی شخص کا مریض یا تندرست ہونا۔ پھر جب ایک شخص کو اس بنا پر سزا نہیں دی جاتی کہ اسے بخار کیوں ہے، تو ایک دوسرے شخص کو اس بنا پر کیوں سزا دی جائے کہ اس نے چوری کیوں کی؟

اس سوال کا جبریت کے پاس بھی کوئی معقول جواب نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ جو بات وہ کہہ سکتی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا میں ہر عمل اپنے کچھ قدرتی نتائج رکھتا ہے۔ جس طرح بیماری کا طبیعی نتیجہ تکلیف ہے اور تندرستی کا طبیعی نتیجہ لذت و راحت، اسی طرح نیک چلنی کا طبیعی نتیجہ مدح اور انعام ہے۔ اور بد چلنی کا طبیعی نتیجہ ذم اور سزا۔ آگ میں ہاتھ ڈالنے سے جس طرح ہاتھ کا جل جانا ضروری ہے اسی طرح جرم کرنے

سے کسی نہ کسی قسم کی سزا پانا بھی ضروری ہے خواہ آدمی پر اس فعل کی کچھ ذمہ داری نہ ہو لیکن یہ جواب صرف اس صورت میں صحیح ہو سکتا ہے کہ ہم انسان کو ایک عقلی و نفسی وجود کے بجائے محض ایک مادّی وجود تسلیم کر لیں، اور یہ مان لیں کہ انسان میں عقل، نفس، روح کوئی چیز نہیں ہے، صرف طبیعت ہے جو ایک لگے بندھے قانون کے مطابق کام کئے جا رہی ہے اور انسان اسی طرح اس کے زیر اثر ہے جس طرح درخت، دریا، پہاڑ، اور دوسری موجودات۔ مگر انسانی زندگی کے مظاہر کی یہ مشینی تعلیل کسی طرح قابلِ قبول نہیں ہے۔ اس کے دلائل، جن پر بحث کرنے کا یہ موقع نہیں ہے، نہایت کمزور ہیں، اور اس کے تسلیم کر لینے کا پہلا نتیجہ یہ ہے کہ قانون، اخلاق، مذہب سب بے قدر و قیمت ہو جائیں اور خود انسان بحیثیت انسان ہونے کے دوسری موجودات کے مقابلہ میں کسی شرفِ عقلی و نفسی کا حامل نہ رہے۔

اخلاقیات کی ناکامی اس تمام بحث کا ماحصل یہ ہے کہ علم الاخلاق جبریت و قدریت کے درمیان فیصلہ کرنے میں ناکام رہا ہے۔ خالص اخلاقی دلائل و شواہد سے ہم کو قطعی طور پر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ انسانی سیرت و کردار کے متعلق جبری نظریہ درست ہے یا قدری نظریہ۔ جتنے قوی دلائل انسان کو ذمہ دار اور فاعل مختار قرار دینے کے حق میں ہیں، قریب قریب اتنے ہی زبردست دلائل اس کو غیر ذمہ دار اور قطعاً بے اختیار قرار دینے کے حق میں بھی ہیں۔

دینیاتی نقطۂ نظر

اب اس مسئلہ کا آخری پہلو باقی رہ گیا ہے، اور وہ دینیاتی پہلو ہے۔ دینیات میں مسئلہ قریب قریب اُسی حیثیت سے آتا ہے جس حیثیت سے فلسفہ میں اس پر بحث کی گئی ہے۔ مگر یہاں مشکلات اُس سے بہت زیادہ ہیں۔ فلسفہ کی نظر تو صرف امورِ ماورائے طبیعت پر ہے اور انسان کی عملی زندگی سے اس کوئی تعلق نہیں ہے جو حکمتِ عملی یا اخلاقیات کو ہے، مگر دینیات نے کسی نہ کسی طور سے حکمتِ عملی اور امورِ ماورائے طبیعت دونوں پر نظر کی ہے اور اپنی تعلیمات میں دونوں کو جمع کیا ہے۔ ایک طرف تو ادیان نے انسان کو اوامر و نواہی کا مخاطب ٹھہرایا ہے اور اطاعت پر جزا اور عصیان پر سزا کے مترتب ہونے کا قانون پیش کیا ہے جس کے لئے انسان کا اپنے اعمال میں ذمہ دار اور کسی نہ کسی حد تک مختار ہونا ضروری ہے اور دوسری طرف وہ ایک ایسی بالاتر ہستی یا ایک ایسے بالاتر قانون کا تصور بھی پیش کرتے ہیں جو انسان سمیت تمام کائنات کو محیط ہے اور جس کی گرفت میں سارا عالم کون و فساد جکڑا ہوا ہے۔ پس دینیات میں یہ مسئلہ فلسفے، طبیعیات اور اخلاقیات، تینوں سے زیادہ مشکل ہے۔ کیونکہ یہ تینوں تو معاملہ کے محض کسی ایک پہلو کا اثبات کرنے اور دوسرے پہلو کو اس کے موافق کرنے کی خاطر توڑنے مروڑنے کے لئے آزاد ہیں، لیکن مذہب بیک وقت دونوں کا اثبات کرتا ہے اور وہ اپنے اس طریقہ کو عقل کے مطابق ثابت کرنے کے لئے مجبور ہے کہ ان دونوں متعارض باتوں میں موافقت کی کوئی متوسط صورت نکالے۔

یہاں اس بحث کا موقع نہیں ہے کہ دنیا کے دوسرے مذاہب نے اس مشکل کو حل کرنے کی کیا صورت اختیار کی ہے، کیونکہ مجھ سے سوال صرف اسلام کے متعلق کیا گیا ہے اور اختصار کی خاطر بھی یہ ضروری

---

d. Theological

معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنی بحث کو صرف اسی حد تک محدود رکھوں۔

صحیح اسلامی مسلک جن مسائل کا تعلق امور ماورائے طبیعت سے ہے ان کے بارے میں اسلام کی صحیح تعلیم یہ ہے کہ جس چیز کا جاننا اور جس حد تک جاننا ضروری تھا وہ اللہ اور اس کے رسول نے بتادی ہے، اس سے زیادہ کا کھوج لگانا، اور ایسی باتوں میں خوض کرنا جن کے متعلق یقینی معلومات حاصل کرنے یا جن کی کنہ کو پہنچنے کے ذرائع ہمارے پاس نہیں ہیں اور جن کے نہ جاننے سے ہم کو کسی قسم کا نقصان بھی نہیں ہے، لاحاصل بھی ہے اور خطرناک بھی۔ اسی لئے قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:-

لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ (۵-۱۴)	ایسی باتوں کے متعلق سوال نہ کرو جن کو اگر تم پر ظاہر کیا جائے تو تم کو برا معلوم ہو۔

اور اسی لئے فرمایا گیا ہے کہ:-

مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا (۵۹-۱)	جو کچھ رسول نے تم کو دے دیا ہے وہ لے لو اور جس سے منع کیا ہے اس سے باز آؤ۔

اور اسی لئے حدیث نبوی میں کثرت سوال اور فضول باتوں میں تکلف کرنے کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اِنَّ مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكَهٗ مَا لَا يَعْنِيْهِ[1] (آدمی کے اسلام کی بہتری اس میں ہے کہ وہ بے فائدہ باتوں کو چھوڑ دے)

یہ تقدیر کا مسئلہ بھی من جملہ انہی مسائل کے ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار تاکید فرمائی ہے کہ اس مسئلہ میں بحث کرنے سے پرہیز کیا جائے۔ ایک مرتبہ صحابہؓ آپس میں اس مسئلہ پر بحث کر رہے تھے۔ اتنے میں آنحضرتؐ تشریف لے آئے اور یہ باتیں سن کر آپ کا چہرہ غصہ سے سرخ ہوگیا۔ آپ نے فرمایا کیا انہی باتوں کا تم کو حکم دیا گیا ہے؟ کیا اسی لئے میں تم میں بھیجا گیا ہوں؟ ایسی ہی باتوں سے پچھلی

---

[1] یہ حدیث امام زہری نے امام زین العابدینؒ کے واسطے سے روایت کی ہے (ترمذی)

قومیں ہلاک ہوئی ہیں میرا فیصلہ یہ ہے کہ تم اس معاملہ میں جھگڑا نہ کرو"۔[1] ایک دوسرے موقع پر آپ نے فرمایا "جو شخص تقدیر کے بارے میں گفتگو کرے گا اس سے تو قیامت کے دن سوال کیا جائے گا، مگر جو خاموش رہے گا اس سے کچھ سوال نہ ہوگا"[2]۔ مطلب یہ کہ یہ مسئلہ ان معاملات میں سے نہیں ہے جن کے بارے میں کوئی نہ کوئی رائے قائم کرنا شرعاً تمہارے لئے ضروری ہو۔ لہٰذا اگر تم اس معاملہ پر کوئی گفتگو نہ کرو تو قیامت میں تم سے کوئی سوال نہ ہوگا لیکن اگر تم نے کلام کیا تو لامحالہ یا وہ غلط ہوگا یا صحیح، اور غلط ہونے کی صورت میں تم ایک ایسی بات میں پکڑے جاؤ گے جس سے بحث کرنے کی تم کو کوئی ضرورت نہ تھی پس بولنے میں نقصان کا احتمال ہے اور نہ بولنے میں کوئی نقصان نہیں۔ ایک اور موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم رات کے وقت حضرت علی اور حضرت فاطمہ علیہما السلام کے مکان پر تشریف لے گئے اور پوچھا تم لوگ نماز تہجد کیوں نہیں پڑھتے؟ حضرت علی نے جواب دیا کہ یا رسول اللہ ہمارے نفس اللہ کے ہاتھ میں ہیں، وہ چاہے گا کہ ہم اٹھیں تو اٹھ جائیں گے"۔ یہ سن کر حضور فوراً واپس ہو گئے اور ران پر ہاتھ مار کر فرمایا:-

وَكَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا[3] — انسان سب سے زیادہ جھگڑالو واقع ہوا ہے

یہی وجہ ہے کہ محدثین اور فقہاء کے گروہ نے صرف وَالْقَدَرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللهِ (تقدیر اچھی اور بری اللہ کی طرف سے ہے) کے مجمل اعتقاد پر اکتفا کیا ہے اور اس باب میں زیادہ

---

[1] یہ حدیث مختلف طریقوں سے حضرت عمرؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت انسؓ، حضرت ابوہریرہؓ، اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مروی ہے (دیکھو ترمذی و ابن ماجہ)۔ [2] یہ حدیث حضرت عائشہؓ سے مروی ہے (ابن ماجہ)

[3] اس حدیث کو زہری نے امام زین العابدین سے اور انھوں نے حسین ابن علی رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے (بخاری، نسائی) محدثین نے آنحضرت کے واپس پلٹ جانے اور آیت پڑھنے کی مختلف توجیہیں کی ہیں، مگر میں اس کے صاف معنی یہ سمجھتا ہوں کہ عملی زندگی کے مسائل میں تقدیر کے مسئلہ سے استدلال کرنے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند نہیں فرمایا۔

کھوج لگانے اور جبر یا قدر کا قطعی حکم لگانے والوں کی وہ سخت مذمت کرتے رہے ہیں لیکن رسولِ اکرمؐ اور بزرگانِ سلف کی ممانعت کے باوجود دوسری قوموں کے مسائل فلسفہ وطبیعیات کا مطالعہ کرنے کی وجہ سے یہ مسئلہ مسلمانوں میں بھی پیدا ہوا اور اس کثرت سے اس پر بحث کی گئی کہ آخر کار یہ اسلامی علم کلام کے مہمات مسائل میں داخل ہو گیا۔

متکلمین اسلام کے مذاہب متکلمین اسلام کے اس بارے میں دو مشہور مذہب ہیں جو قدریہ اور جبریہ کہلاتے ہیں یہاں ان کی تمام بحثوں کو نقل کرنا بہت مشکل ہے۔ اس کے لئے ایک مستقل کتاب کی وسعت درکار ہے۔ تاہم میں ان کے مقالات کا ایک واضح خلاصہ یہاں پیش کروں گا۔

مذہب قدر معتزلہ اور بعض دوسرے فرقوں کا اعتقاد یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو پیدا کیا۔ اس کو افعال پر قدرت بخشی اور نیکی وبدی کا اختیار اسی کو تفویض کر دیا۔ اب وہ خود اپنی قدرت کے مطابق اور اپنی مشیت کے موافق استقلال کے ساتھ اچھے اور برے افعال کرتا ہے اور اپنے اسی اختیار کی بنا پر دنیا میں مدح وذم اور آخرت میں ثواب وعذاب کا مستحق ہوتا ہے۔ اللہ کی طرف سے نہ اس کو کفر ومعصیت پر مجبور کیا گیا ہے اور نہ ایمان واطاعت پر، بلکہ وہ اپنے رسولوں کو بھیجتا ہے، کتابیں نازل کرتا ہے، نیکی کا حکم دیتا اور بدی سے منع فرماتا ہے، صحیح اور غلط، حق اور باطل کو واضح طور پر ممیز کرتا ہے، اور ان کو خبردار کر دیتا ہے کہ اگر سیدھا راستہ اختیار کرو گے تو نجات پاؤ گے اور غلط راستہ پر چلو گے تو اس کا برا نتیجہ دیکھو گے۔

اس مذہب کے قواعد سب سے پہلے واصل بن عطا الغزال نے مقرر کئے تھے جس کا قول تھا کہ باری تعالیٰ حکیم عادل ہے۔ اس کی طرف شر اور ظلم کی اضافت جائز نہیں ہے۔ نہ یہ جائز ہے کہ اللہ نے خود ہی اپنے بندوں کو جن اوامر ونواہی سے مکلف کیا ہے ان کے خلاف اعمال کے صدور کا وہ خود ارادہ کرے، اور نہ یہ جائز ہے کہ وہ بندوں کو کسی ایسے فعل پر سزا دے جس کا ارتکاب انھوں نے اس کے حکم ہی سے کیا ہو۔

لہٰذا بندہ ہی فاعل خیر و شر ہے، وہی ایمان و کفر اور اطاعت و معصیت اختیار کرتا ہے، اور اللہ نے ان سب کاموں کی قدرت اس کو عطا کر دی ہے - ابراہیم بن سیّار النظّام نے اس پر یہ اضافہ کیا کہ خدا صرف خیر پر قدرت رکھتا ہے، شرور و معاصی اس کی قدرت سے خارج ہیں معمر بن عباد السلمی اور ہشام بن عمرو الفوطی نے اس میں اور زیادہ شدّت اختیار کی اور وَالْقَدَرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ مِنَ اللّٰہِ کا اعتقاد رکھنے والے کو کافر اور گمراہ ٹھیرایا، کیونکہ یہ اعتقاد ان کے نزدیک باری تعالیٰ کی تنزیہ کے خلاف ہے، اور اس کی رو سے حق تعالیٰ ظالم ٹھیرتا ہے - ان کے بعد جاحظ، خیاط، کعبی، جبائی، قاضی عبدالجبار وغیرہ جتنے بڑے بڑے معتزلہ گذرے ہیں سب نے پورے زور کے ساتھ یہ حکم لگایا ہے کہ بندوں کے افعال کا خالق خدا نہیں ہے بلکہ بندے خود ان کے خالق ہیں، اور یہ کہ خدا کے لئے تکلیف مالا یطاق جائز نہیں ہے۔

قرآن مجید سے قدریہ کا استدلال اس مذہب کی تائید میں معتزلہ نے قرآن مجید کی بہت سی آیات سے استدلال کیا ہے۔ مثلاً :-

(۱) وہ آیات جن میں بندوں کے افعال خود بندوں ہی کی طرف منسوب کئے گئے ہیں جیسے

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ (بقرہ - ۳)	تم کیسے خدا کے ساتھ کفر کرتے ہو حالانکہ تم بے جان تھے خدا نے تم کو زندہ کیا۔
فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتَابَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (بقرہ - ۹)	پس تباہی ہے ان لوگوں کے لئے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہے۔
ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (انفال - ۷)	یہ اسی وجہ سے ہے کہ خدا کی نعمت کو جو اس نے کسی قوم کو دی ہو بدلتا نہیں ہے جب تک کہ وہ خود اپنی حالت کو نہیں بدل دیتی
مَنْ يَعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ (نساء - ۱۸)	جو بُرا عمل کرے گا اسی کے مطابق بدلا پائے گا۔
كُلُّ امْرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ (الطور - ۱)	ہر شخص اپنی کمائی کے بدلے رہن ہے۔

(۲) وہ آیات جن میں کہا گیا ہے کہ انسان کے اپنے اعمال پر جزا و سزا مترتب ہوگی۔ جیسے

اَلْیَوْمَ تُجْزٰی كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ (المومن-۲)	آج ہر نفس کو اس کی کمائی کے مطابق بدلا دیا جائے گا۔
اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (الجاثیہ-۴)	آج تم کو ان اعمال کا بدلہ دیا جائے گا جو تم کرتے تھے۔
هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (النمل-۷)	کیا تمھیں اس کے سوا کوئی اور بدلا دیا جائیگا جو تم عمل کرتے رہے ہو؟

(۳) وہ آیات جن میں شر اور ظلم اور مذمومات سے باری تعالیٰ کے فعل کو منزہ قرار دیا گیا ہے۔ جیسے

اَلَّذِیْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ (السجدہ-۱)	جس نے ہر چیز جو پیدا کی خوب ہی پیدا کی۔

اور ظاہر ہے کہ کفر اچھی چیز نہیں ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا	اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور ان دونوں کے درمیان
بَیْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ (الحجر-۶)	جو کچھ ہے اس کو پیدا نہیں کیا مگر حق کے ساتھ۔

اور مسلم ہے کہ کفر حق نہیں ہے۔

وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ (حم السجدہ-۶)	اور تیرا رب بندوں کے لئے ہرگز ظالم نہیں ہے۔
وَمَا اللّٰهُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِیْنَ (آل عمران-۱۱)	اور اللہ جہان والوں کیلئے ہرگز ظلم کا ارادہ نہیں رکھتا۔

(۴) وہ آیات جن میں کافروں اور گنہگاروں کو ان کے برے افعال پر ملامت کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ ان کو ایمان و طاعت سے روکنے والی کوئی چیز خدا کی طرف سے نہیں ہے۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ	لوگوں کے پاس جب ہدایت آئی تو انھیں ایمان لانے سے
الْهُدٰٓی اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا	روکنے والی کوئی چیز اس کے سوا نہ تھی کہ انھوں نے کہا کیا
(بنی اسرائیل-۱۱)	اللہ نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے؟
مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ (ص-۵)	تجھے کس چیز نے اس سے روکا کہ تو سجدہ کرے؟
فَمَا لَهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ (الانشقاق)	انھیں کیا ہو گیا ہے کہ ایمان نہیں لاتے؟

لِمَ تَصُدُّونَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (آل عمران ۱) تم کیوں خدا کی راہ سے روکتے ہو؟

اگر فی الواقع خدا نے ہی لوگوں کو ایمان لانے سے روکا ہوتا اور انھیں کفر و معصیت پر مجبور کیا ہوتا تو ان سے اس قسم کے سوالات کرنے جائز نہ ہوتے۔ اگر کوئی شخص کسی کو حجرے میں بند کر دے اور کہے کہ تو کیوں نہیں نکلتا تو یہ ایک غیر معقول سوال ہوگا۔ پھر خدا کی طرف سے یہ بات کیسے منسوب کی جاسکتی ہے کہ ایک طرف تو ان کو حق سے پھیر دے اور پھر کہے کہ تم کہاں پھرے چلے جا رہے ہو؟ (اَنّٰی تُصْرَفُوْنَ) خود ان کو بھٹکائے اور پوچھے کہ تم کدھر بھٹکے جا رہے ہو؟ (اَنّٰی تُؤْفَکُوْنَ)۔ ان میں کفر خلق کرے اور پھر پوچھے کہ تم کیوں کفر کرتے ہو؟ (لِمَ تَکْفُرُوْنَ)۔ انھیں حق پر باطل کے پردے ڈالنے پر مجبور کرے اور پھر کہے کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو؟ (لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ)۔

(۵) وہ آیات جن میں ایمان اور کفر کو بندوں کی مشیت سے متعلق کیا گیا ہے۔ جیسے۔

فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ (الکہف ۔ ۴) پس جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے انکار کرے۔

فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّہٖ سَبِیْلًا (المزمل ۱۰) پس جس کا جی چاہے اپنے رب کا راستہ اختیار کرے

یہی نہیں بلکہ ان لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو اپنے کفر و معصیت کو مشیت الٰہی کی طرف منسوب کرتے ہیں جیسے

سَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰہُ مَآ اَشْرَکْنَا (الانعام ۔ ۱۸) مشرکین ضرور کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم ہرگز شرک نہ کرتے

وَقَالَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰہُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِہٖ (النحل ۔ ۵) اور مشرکین نے کہا کہ اگر اللہ چاہتا تو اس کے سوا ہم کسی کی عبادت نہ کرتے۔

(۶) وہ آیات جن میں بندوں کو حسن عمل کی طرف دعوت دی گئی ہے۔ مثلاً۔

وَسَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ (آل عمران ۱۴) اور دوڑو اپنے رب کی مغفرت کی طرف

اَجِیْبُوْا دَاعِیَ اللّٰہِ (الاحقاف-۴)	اللہ کے منادی کی پکار پر لبیک کہو۔
وَاَنِیْبُوْا اِلٰی رَبِّکُمْ (الزمر-۶)	اپنے رب کی طرف رجوع کرو۔

ظاہر ہے کہ طاعت کا حکم دینا اور اس کی طرف دوڑنے اور لپکنے کی تاکید کرنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے، جب تک کہ مامور میں اس کی قدرت نہ ہو۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کسی اپاہج سے کہا جائے کہ اٹھ اور دوڑ۔

(۷) وہ آیات جن میں بیان کیا گیا ہے کہ بندے ایسے افعال کرتے ہیں کہ جن کا خدا نے ان کو حکم نہیں دیا ہے۔ جیسے

یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْا اِلَی الطَّاغُوْتِ	وہ ارادہ رکھتے ہیں کہ اپنا مقدمہ طاغوت کے پاس لے جائیں
وَقَدْ اُمِرُوْا اَنْ یَّکْفُرُوْا بِہٖ (النساء-۹)	حالانکہ انھیں حکم دیا گیا تھا کہ اس کا انکار کریں۔
اِنَّ اللّٰہَ لَا یَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ (الاعراف-۳)	اللہ بے شرمی کے کاموں کا ہرگز حکم نہیں دیتا۔
وَلَا یَرْضٰی لِعِبَادِہِ الْکُفْرَ (الزمر-۱)	اور وہ اپنے بندوں کے لئے کفر کو پسند نہیں کرتا۔
وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ (الانفال ۹)	اور انھیں حکم نہیں دیا گیا تھا مگر یہ کہ اللہ کی عبادت کریں۔

(۸) وہ آیات جن میں کہا گیا ہے کہ لوگ اپنے کئے کی سزا بھگتتے ہیں۔ جیسے

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا	خشکی اور تری میں فساد پھوٹ پڑا لوگوں کے اپنے ہاتھوں
کَسَبَتْ اَیْدِی النَّاسِ (الروم-۵)	کی کمائی کے سبب سے۔
وَمَآ اَصَابَکُمْ مِّنْ مُّصِیْبَۃٍ فَبِمَا	تم پر جو مصیبت بھی آئی ہے تمہارے اپنے ہاتھوں کی
کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ (الشوریٰ-۴)	کمائی ہے۔
اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظْلِمُ النَّاسَ شَیْئًا وَّ	یقیناً اللہ لوگوں پر کوئی ظلم نہیں کرتا بلکہ لوگ خود اپنے
لٰکِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَھُمْ یَظْلِمُوْنَ (یونس-۵)	اوپر ظلم کرتے ہیں۔
وَمَا کُنَّا مُھْلِکِی الْقُرٰٓی اِلَّا وَاَھْلُھَا	اور ہم ہرگز بستیوں کو ہلاک کرنے والے نہیں ہیں الّا یہ
ظٰلِمُوْنَ (القصص-۶)	کہ ان کے باشندے ظالم ہوں۔

(۹) وہ آیات جن سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا ہدایت اور گمراہی پر مجبور نہیں کرتا بلکہ انسان خود اپنے اختیار سے کوئی ایک راستہ منتخب کرتا ہے۔ مثلاً

وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى (حم السجدہ - ۲)	رہے ثمود تو ان کو ہم نے راستہ دکھایا مگر انھوں نے اندھے بن کر چلنے کو راستہ دیکھ کر چلنے پر ترجیح دی۔
فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِىْ لِنَفْسِهٖ (یونس - ۱۰)	جو ہدایت قبول کرلے اس کا ہدایت قبول کرنا اسکے اپنے ہی لئے مفید ہے۔
لَآ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى (بقرہ - ۲۴)	دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے، راست روی کج روی سے ممیز کرکے پیش کردی گئی ہے۔ اب جو طاغوت سے کفر کرے اور اللہ پر ایمان لے آئے اس نے ایک مضبوط سہارا تھام لیا۔

(۱۰) وہ آیات جن میں انبیاء نے اپنے قصوروں کا اعتراف کیا ہے اور ان کو خود اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ مثلاً:-

حضرت آدم علیہ السلام کہتے ہیں۔

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا (اعراف - ۲)	اے ہمارے رب ہم نے اپنے اوپر آپ ظلم کیا۔

حضرت یونس علیہ السلام کہتے ہیں۔

سُبْحٰنَكَ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (انبیاء - ۶)	پاک ہے تیری ذات، قصوروار تو میں خود ہی تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں۔

رَبِّ اِنِّىْ ظَلَمْتُ نَفْسِىْ (قصص - ۲)	پروردگار! میں نے اپنے اوپر ظلم کیا۔

حضرت نوح علیہ السلام کہتے ہیں۔

رَبِّ اِنِّیۡۤ اَعُوۡذُ بِکَ اَنۡ اَسۡـَٔلَکَ مَا لَیۡسَ لِیۡ بِہٖ عِلۡمٌ (ہود - ۴)

پروردگار! میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ میں تجھ سے ایسی درخواست کروں جس کے ماننا ہونیکا سبب مجھے علم نہ ہو

مذہب جبر

دوسری طرف جبریہ ہیں جو کہتے ہیں کہ وجود میں کوئی چیز اللہ کے ارادے کے بغیر داخل نہیں ہوتی، عام اس سے کہ وہ اشیاء کی ذوات ہوں یا ان کی صفات۔ ان کا اعتقاد یہ ہے کہ کائنات میں ہر ہر ذرہ کی حرکت قضاو قدر کے تحت واقع ہوتی ہے، وجود اور ایجاد میں اللہ کے سوا کوئی چیز تاثیر نہیں رکھتی، خلق اور ابداع میں اللہ کے ساتھ کوئی چیز شریک نہیں ہے، جو کچھ اللہ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے اور جو اللہ نہیں چاہتا وہ نہیں ہوتا، کوئی شے اس کے حکم اور اس کی قضا کے خلاف بال برابر حرکت نہیں کر سکتی، اس کے افعال پر حسن یا قبح کا حکم لگانا عقل کے امکان میں نہیں ہے، اس سے جو کچھ صادر ہوتا ہے بہتر ہی ہوتا ہے، دنیا میں ہم جن حوادث کو اسباب کے تحت صادر ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں وہ محض ظاہر کے لحاظ سے تحت اسباب ہیں ورنہ حقیقتاً سب کا صدور اللہ تعالیٰ سے ہوتا ہے اور تمام ارضی و سماوی حوادث کا فاعل حقیقی وہی ہے۔

اس اصل سے متعدد فرعی اعتقادات نکلے ہیں۔ جہم بن صفوان اور شیبان بن سلمہ خارجی کا مذہب یہ ہے کہ انسان اپنے افعال میں مجبور محض ہے، نہ وہ ارادہ رکھتا ہے اور نہ اختیار، اللہ تعالیٰ جس طرح جمادات نباتات اور دوسری چیزوں میں افعال پیدا کرتا ہے اسی طرح انسان میں بھی پیدا کرتا ہے انسان کی طرف افعال کی نسبت محض مجازی ہے، رہا ثواب و عقاب تو جس طرح افعال جبری ہیں اسی طرح وہ بھی جبری ہے یعنی جس طرح جبر کی بناء پر انسان اچھے اور برے افعال کرتا ہے اسی طرح جبر کی بناء پر اسے جزا اور سزا بھی دی جاتی ہے۔ یہ خالص جبریت ہے جو معتزلہ کی خالص قدریت کے مقابلہ میں ہے۔

ایک دوسری جماعت، جس میں حسین النجار، بشر بن غیاث المریسی، ضرار بن عمرو، حفص الفرد، ابو عبد اللہ محمد بن کرام، شعیب بن محمد الخارجی اور عبد اللہ بن اباض بانی فرقۂ اباضیہ وغیرہ شامل ہیں خدا

کو انسان کے اچھے اور بُرے اعمال کا خالق تو قرار دیتی ہے، مگر اس کی رائے میں بندوں کو ایک طرح کی قدرت و ارادۂ حادثہ بھی حاصل ہے، جس کا کچھ نہ کچھ حصہ ان افعال کے صدور میں ضرور ہے۔ اس کا نام انھوں نے "کسب" رکھا ہے، اسی کسب کی وجہ سے انسان کو امر و نہی کے احکام دیئے گئے ہیں اور اسی کے لحاظ سے آدمی عذاب و ثواب کا مستحق ہوگا۔

امام ابوالحسن اشعری نے "کسب" کو تو تسلیم کیا اور اس کے لئے قدرت حادثہ بھی ثابت کی، مگر اس قدرت کی تاثیر سے انکار کر دیا۔ یعنی ان کے نزدیک اللہ اپنے بندے سے جس فعل کے صدور کا ارادہ کرتا ہے وہ بندہ کی قدرت حادثہ کے تحت صادر ہو جاتا ہے، لیکن یہ قدرت محض ایک آلہ ہے ارادۂ الٰہی کے فعل میں آنے کا، ورنہ حقیقتاً خود اس قدرت میں کوئی تاثیر نہیں جو فعل کے وجود میں آنے کی علت ہو۔

قاضی ابوبکر باقلانی نے اس سے تھوڑا سا اختلاف کیا ہے۔ ان کی رائے میں انسان کے ہر فعل کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو اس کے نفس فعل ہونے کا ہے بلا اعتبار حسن و قبح و خیر و شر، اور دوسرا پہلو اس کے طاعت اور معصیت ہونے کا ہے۔ مثلاً نماز اور روزہ کہ اس کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ وہ نفس قیام اور قعود اور ترکِ غذا اور ترکِ مباشرت ہے، اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ عبادت اور طاعت ہے، ان میں سے پہلا رخ باری تعالیٰ کی طرف منسوب ہوگا کیونکہ وہ اسی کی قدرت سے ظہور میں آتا ہے، اور دوسرا رُخ بندہ کی طرف کیونکہ اسی پہلو سے ایک فعل بندے کی قدرت حادثہ کے تحت رونما ہوتا ہے اور اسی پر جزا و سزا مترتب ہوتی ہے۔

استاذ ابواسحٰق اسفرائینی نے اس مسلک سے بھی اختلاف کیا ہے۔ ان کے نزدیک فعل بجائے خود اور فعل کی صفات (یعنی اس کا حسن و قبح) دونوں معاً بندے اور خدا دونوں کی قدرت کے تحت ظہور میں آتے ہیں۔

امام الحرمین نے ان دونوں کے مذہب کو رد کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ نے بندے میں قدرت اور ارادہ پیدا کیا ہے پھر اسی قدرت اور ارادہ سے بندے کے مقدورات اور مرادات حاصل ہوتے ہیں

آخر میں امام رازی آتے ہیں جو مذہب جبر کے پر زور وکیل ہیں۔ وہ بندے کی قدرت کے لئے کسی قسم کی تاثیر تسلیم نہیں کرتے "کسب" کو ایک اسم بلا مسمی سمجھتے ہیں۔ خدا کو بندوں کے تمام اعمال کا خالق قرار دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ کفر اور ایمان، طاعت اور معصیت، ہدایت اور ضلالت، سب کچھ خدا ہی اپنے بندوں میں پیدا کرتا ہے۔ اُن کے نزدیک یہ ممکن نہیں ہے کہ خدا کسی سے کفر کے صدور کا ارادہ کرے اور وہ مومن ہو جائے؛ خدا کے علم میں کوئی شخص مومن ہو اور وہ کافر ہو جائے، خدا نے کسی میں طاعت پیدا کی ہو اور وہ اس کے خلاف عاصی ہو جائے۔ رہا یہ سوال کہ جب ان سب چیزوں کا فیصلہ پہلے سے ہو چکا ہے، اور بندوں میں اس کے خلاف چلنے کی طاقت نہیں ہے، تو پھر اوامر و نواہی کی تکلیف کیونکر جائز اور معقول ہو سکتی ہے؟ تو اس کا جواب امام صاحب یہ دیتے ہیں کہ خدا کے لئے تکلیف ما لا یطاق جائز ہے اور اس کے کاموں میں کیوں اور کس لئے کا سوال نہیں ہو سکتا۔

بہر حال اشاعرہ اور ان کے ہم خیال حضرات خواہ کسب کے قائل ہوں یا نہ ہوں، اور قدرت حادثہ کے لئے کسی قسم کی تاثیر مانتے ہوں یا نہ مانتے ہوں، ان کے استدلال کا منطقی نتیجہ خالص جبریت ہے۔ کیونکہ جب خدا اپنے بندوں کا خالق ہے اور اسی نے ان سے اچھے اور برے اعمال کے صدور کا ارادہ کیا ہے تو دو صورتوں میں سے ایک صورت ضرور ہوگی۔ یا تو بندہ میں قضائے الٰہی کے خلاف عمل کرنے کی قدرت ہوگی یا نہ ہوگی۔ صورتِ اول میں بندہ کی قدرت اور اس کے ارادہ کا خدا کی قدرت اور اس کے ارادہ پر غالب آ جانا لازم آتا ہے جو بالاتفاق باطل ہے۔ بصورتِ دوم خدا کی قدرت کے آگے بندہ کی قدرت کا بے اثر اور خدا کے ارادہ کے سامنے بندہ کے ارادہ کا بے چارہ ہونا لازم آتا ہے جس کے بعد کسب اور قدرتِ حادثہ کا عدم اور وجود برابر ہے۔ یہی خالص جبریت ہے اور یہ ایک کھلی ہوئی بات

ہے کہ جبریت کے مقدمات کو تسلیم کر لینے کے بعد کوئی شخص عقیدہ جبر کی انتہا کو پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بیچ میں کسی مقام پر ٹھیر جانا اس کے لئے ممکن نہیں ہے۔[له]

قرآن مجید سے جبریہ کا استدلال لطف یہ ہے کہ جبریہ بھی اپنے مذہب کے حق میں قرآن مجید ہی سے ثبوت پیش کرتے ہیں، اور ایک دو نہیں سینکڑوں آیتیں ایسی پیش کر دیتے ہیں جو قدریت کی مخالف

له بالکل یہی حال مسیحی متکلمین کا بھی ہے۔ ان کے ایک بڑے گروہ کے عقائد اس باب میں وہی ہیں جو اشاعرہ کے ہیں سینٹ اگسٹائن (Augustine) نے جبریت خالصہ سے بچنے کی بہت کوشش کی ہے، مگر خدا کو فاعل حقیقی اور انسان کو محض ایک منفعل ہستی مان لینے کے بعد وہ اپنے مذہب کو خالص جبریت سے نہیں بچا سکا۔ اس کوٹس اریجنا (Scotus Erigena) جو مدرسیت (Scholasticism) کا بانی اول ہے، خدا کے فاعل افعالِ عباد ہونے میں انتہا درجہ کا غلو کرتا ہے۔ اس کے نزدیک خدا تمام کائنات کی روح ہے، اور وہ خدا ہی ہے جو زندگی، قوت، نور، عقل بن کر موجودات عالم میں اپنے کرشمے دکھا رہا ہے۔ سینٹ آنسلم (St. Anselm) عام مسیحی اعتقاد کے مطابق انسان کے پیدائشی گناہ، اور پھر خدا کے مسیح کی شکل میں نزول کرنے اور انسان کے گناہ کا کفارہ بننے کا قائل ہے، اور ظاہر ہے کہ اس اعتقاد میں جبریت کے سوا کسی اور چیز کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ ابیلارڈ (Abelard) اور سینٹ ٹامس اکوین (St. Thomas of Aquin) دونوں ارادۂ الٰہی کو وجوبی و جبری قرار دیتے ہیں اور ان کے نزدیک خدا ہی بندوں کے تمام اعمال کا خالق ہے۔ بلکہ موخر الذکر نے تو اشاعرہ سے تکلیف مالا یطاق کے جواز کا عقیدہ بھی اخذ کر لیا ہے۔ ممتاز مدرسین میں صرف ایک ڈنس اسکوٹس (Duns Scotus) ایسا شخص ہے جس نے معتزلہ کی طرح قدریت کا مذہب اختیار کیا ہے۔ اس کے نزدیک انسان کو ارادہ کرنے یا نہ کرنے اور اپنے ارادہ کو فعل میں لانے یا نہ لانے کا پورا اختیار حاصل ہے، اور خدا کی قدرت انسان کی آزادی اختیار میں مانع نہیں ہے۔

اور جبریت کی زبردست مؤید ہیں مثلاً

(۱) وہ آیات جن سے ثابت ہوتا ہے کہ تمام قوت کا مالک خدا ہے جو ہر چیز پر قادر ہے اور ہر چیز کا خالق ہے۔ دنیا میں اس کے اذن کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔

اَنَّ الْقُوَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیْعًا (بقرہ - ۲۰)	یہ کہ قوت ساری کی ساری اللہ ہی کی ہے۔
وَمَا ھُمْ بِضَآرِّیْنَ بِہٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ (بقرہ - ۱۲)	اور وہ اپنے اس جادو کے ذریعہ سے کسی کو ضرر نہیں پہنچا سکتے تھے مگر اللہ کے اذن سے۔
اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (اعراف - ۷)	خبردار! خلق اور امر دونوں اسی کے ہیں۔
قُلِ اللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ وَّھُوَ الْوَاحِدُ الْقَھَّارُ (الرعد - ۲)	کہو، اللہ ہر چیز کا خالق ہے اور وہ ایک ہے اور سب پر غالب ہے۔

وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ (الصّٰفّٰت - ۳) حالانکہ اللہ نے تمھیں بھی پیدا کیا اور ان چیزوں کو بھی جنھیں تم بناتے ہو۔

(۲) وہ آیات جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر واقعہ کے متعلق خدا کا فیصلہ پہلے ہی سے لکھا جا چکا ہے اور دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اسی فیصلہ کے مطابق ہوتا ہے۔

وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰی وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِہٖ وَمَا یُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا یُنْقَصُ مِنْ عُمُرِہٖٓ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ (فاطر - ۲)	نہیں حاملہ ہوتی کوئی مادہ اور نہیں وضع حمل کرتی مگر وہ اسکے علم میں ہوتی ہے اور نہیں دراز ہوتی کسی دراز عمر والے کی عمر نہ کسی کی عمر میں کوئی کمی ہوتی ہو مگر یہ سب کچھ ایک نوشتہ میں لکھا ہے۔
وَقَضَیْنَآ اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ فِی الْکِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِی الْاَرْضِ مَرَّتَیْنِ (بنی اسرائیل - ۱)	اور ہم نے بنی اسرائیل کو بتا دیا تھا کتاب میں کہ تم دو دو مرتبہ زمین میں فساد برپا کرو گے۔
وَمَآ اَصَابَکُمْ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰہِ (آل عمران - ۱۷)	اور جو مصیبت تم پر دونوں گروہوں کی مڈبھیڑ کے روز پیش آئی وہ اللہ کے اذن سے پیش آئی۔

مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِى الْاَرْضِ — کوئی مصیبت زمین میں یا تمہارے اپنے نفوس میں
وَلَا فِىْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ — نہیں پہنچتی مگر یہ کہ وہ ایک نوشتہ میں لکھی ہوئی ہوتی ہے
اَنْ نَّبْرَاَهَا (الحدید ۳) — قبل اس کے کہ ہم اسے ظہور میں لائیں۔

(۳) وہ آیات جن سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے ہر چیز کے لئے ایک تقدیر مقرر کر دی ہے۔ رزق، عزت و دولت، راحت و مصیبت، موت و حیات، سب اسی تقدیر کے مطابق ہیں۔ اس میں کمی بیشی ممکن نہیں ہے:-

اِنَّا كُلَّ شَىْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ (القمر ۳) — ہم نے ہر چیز جو پیدا کی ہے اسے ایک اندازے پر رکھا ہے۔
لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ — آسمانوں اور زمین کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں جس کے لئے
يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ (الشوریٰ ۲) — چاہتا ہے رزق کشادہ کر دیتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے
وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ (الشوریٰ ۳) — مگر وہ نازل کرتا ہے ایک اندازے پر جو وہ چاہتا ہے۔
وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ — اگر انہیں کوئی بھلائی نصیب ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ
مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ — اللہ کی طرف سے ہے اور اگر مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں
يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ قُلْ كُلٌّ — یہ تمہاری بدولت ہے۔ کہو، سب کچھ اللہ ہی کی طرف
مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ (النساء ۱۱) — سے ہے۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ — ہر قوم کے لئے ایک مدت ہے پھر جب ان کی مدت آن پوری
لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (اعراف ۴) — ہوتی ہے تو ایک گھڑی بھر کی بھی تقدیم و تاخیر نہیں ہوتی۔

(۴) وہ آیات جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بندے کی مشیت خدا کی مشیت کے تابع ہے، بندے کو کچھ اختیار نہیں، سب کچھ خدا کے اختیار میں ہے، انسان اپنی تدبیر سے خدا کے فیصلوں کو بدلنے کی قوت نہیں رکھتا:

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (الدہر ۲) — اور تم کیا چاہتے ہو الا یہ کہ اللہ چاہے۔

لَیْسَ لَکَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ (آل عمران ۱۳)	تیرے ہاتھ میں کچھ اختیار نہیں ہے
وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِکَ	اور کبھی کسی چیز کے متعلق یوں نہ کہو کہ میں کل ایسا کر کے رہوں گا
غَدًا اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ (کہف - ۲)	(تمہاری یہ بات پوری نہیں ہو سکتی) الا یہ کہ اللہ چاہے۔
قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ کُلَّہٗ لِلّٰہِ (آل عمران - ۱۶)	کہو اختیار بالکل اللہ کا ہے۔
قُلْ لَّوْ کُنْتُمْ فِیْ بُیُوْتِکُمْ لَبَرَزَ الَّذِیْنَ	کہو اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن کے نصیب میں
کُتِبَ عَلَیْھِمُ الْقَتْلُ اِلٰی مَضَاجِعِھِمْ (آل عمران ۱۶)	قتل لکھ دیا گیا تھا وہ اپنے مقتل کی طرف خود نکل آتے۔
وَاِنْ یَّمْسَسْکَ اللّٰہُ بِضُرٍّ فَلَا کَاشِفَ	اگر اللہ تجھے کسی تکلیف میں مبتلا کرے تو اسے ہٹانے والا
لَہٗٓ اِلَّا ھُوَ وَاِنْ یَّمْسَسْکَ بِخَیْرٍ فَھُوَ عَلٰی کُلِّ	کوئی نہیں اس کے سوا اور اگر وہ تیرے لئے کچھ بہتری کرے تو وہ
شَیْءٍ قَدِیْرٌ وَھُوَ الْقَاھِرُ فَوْقَ عِبَادِہٖ (انعام - ۲)	ہر چیز پر قادر ہے اور وہ اپنے بندوں پر پورا غلبہ رکھتا ہے۔
فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا وَلَنْ	پس تم خدا کے ضابطے میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے، اور نہ کوئی
تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَحْوِیْلًا (فاطر - ۵)	ایسی طاقت پاؤ گے جو اللہ کے ضابطہ کو پھیر دے۔

(۵) وہ آیات جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہدایت اور ضلالت کا رشتہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے۔

یُضِلُّ بِہٖ کَثِیْرًا وَّیَھْدِیْ بِہٖ کَثِیْرًا (البقرہ ۳)	اللہ اسکے ذریعے سے بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو راہ راست دکھاتا ہے
مَنْ یَّشَاِ اللّٰہُ یُضْلِلْہُ وَمَنْ یَّشَاْ	اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے
یَجْعَلْہُ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (انعام ۴)	سیدھی راہ پر لگا دیتا ہے۔
فَمَنْ یُّرِدِ اللّٰہُ اَنْ یَّھْدِیَہٗ یَشْرَحْ	پس اللہ جس کو ہدایت دینا چاہتا ہے اس کا سینہ
صَدْرَہٗ لِلْاِسْلَامِ (انعام - ۱۵)	اسلام کے لئے کھول دیتا ہے۔
اَتُرِیْدُوْنَ اَنْ تَھْدُوْا مَنْ اَضَلَّ	کیا تم چاہتے ہو کہ ہدایت بخشو اس شخص کو جسے اللہ نے

اللّٰهُ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا (نساء ۱۲)

گمراہ کیا ہو، حالانکہ جسے اللہ نے گمراہ کیا ہو اس کے لئے تم کوئی راستہ نہیں پا سکتے۔

وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ (مائدہ - ۲)

جسے اللہ فتنہ میں ڈالنا چاہے اسے تم اللہ سے نہیں بچا سکتے۔ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ ہی نے پاک کرنا نہ چاہا۔ . . . . .

. . . .

وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (انعام - ۱۴)

اگر ہم ان کی طرف ملائکہ کو بھی نازل کر دیتے اور مردے ان سے باتیں کرتے اور ہر چیز کو ہم ان کے آگے رو در رو جمع کر دیتے تب بھی وہ ایمان لانے والے نہ تھے الا یہ کہ اللہ ہی چاہے۔

(۶) وہ آیات جن میں کہا گیا ہے کہ خدا کی مشیت ہی یہ نہ تھی کہ سب لوگ ایمان لے آئیں۔ اور اختلاف نہ کریں ورنہ خدا چاہتا تو سب ایمان لے آتے اور دین کے معاملہ میں کوئی جھگڑا باقی نہ رہتا۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ (بقرہ - ۲۳)

اگر اللہ چاہتا تو وہ نہ لڑتے۔ مگر اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِى الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (یونس - ۱۰)

اگر تیرا رب چاہتا تو سب لوگ ایمان لے آتے جو زمین میں ہیں۔ پھر کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا کہ ایمان لائیں؟ حالانکہ کوئی متنفس مومن نہیں ہو سکتا اللہ کے اذن کے بغیر۔

اس ضمن میں وہ آیات بھی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ بہت لوگ دوزخ ہی کیلئے پیدا کئے گئے ہیں مثلاً

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ (اعراف-۲۲)

ہم نے بہت سے جنوں اور انسانوں کو جہنم ہی کے لئے پیدا کیا ہے۔

(۷) وہ آیات جن میں بتایا گیا ہے کہ خدا نے کافروں اور منافقوں کو ایمان اور حسن عمل سے روک دیا ہے، اور ایسے لوگ راہ راست پر آ ہی نہیں سکتے۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ وہ اوامر و نواہی کے لئے مکلف قرار دیے گئے ہیں اور سرتابی و سرکشی کے عوض ان کو عذاب کی دھمکی دی گئی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (بقرہ-۱)

حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں نے کفر کیا ہے ان کے لئے یکساں ہے خواہ تم انھیں ڈراؤ یا نہ ڈراؤ وہ بہرحال ایمان نہ لائیں گے۔ اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر کر دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں اور ان کے لئے بڑی سزا ہے۔

فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا (بقر-۲)

ان کے دلوں میں بیماری ہے پس اللہ نے ان کی بیماری کو اور بڑھا دیا۔

وَجَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَن يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا (انعام-۳)

اور ہم نے ان کے دلوں پر غلاف چڑھا دیئے ہیں کہ وہ کچھ نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں گرانی پیدا کر دی ہے۔

وَلَٰكِن كَرِهَ اللَّهُ انبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ

مگر اللہ نے ان کے اٹھنے کو پسند نہ کیا اس لئے اس نے انھیں سست کر دیا

وَنَطْبَعُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ (اعراف-۱۳)

اور ہم ان کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں اس لئے وہ نہیں سنتے۔

(۸) وہ آیات جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کافروں کو جن برے اعمال کی وجہ سے دنیا اور آخرت میں مبتلائے عذاب کیا جاتا ہے وہ خدا ہی کے حکم و ارادے کے تحت ان سے سرزد ہوتے ہیں۔

وَإِذَا أَرَدْنَا أَن نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا

اور جب ارادہ کرتے ہیں کہ کسی بستی کو ہلاک کریں تو بستی کے

مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا (بنی اسرائیل - ۲)	خوشحال لوگوں کو حکم دیتے ہیں پھر وہ اس بستی میں فسق کرتے ہیں
وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ أَكَابِرَ	اور ہم نے اسی طرح ہر بستی میں اس کے بڑے بڑے مجرموں
مُجْرِمِيهَا لِيَمْكُرُوا فِيهَا (انعام - ۱۵)	کو لگا رکھا ہے کہ وہ اس میں چالبازیاں کریں۔
زَيَّنَّا لَهُمْ أَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُونَ (النمل - ۱)	ہم نے انکے اعمال کو ان کیلئے خوشنما بنا دیا ہے پس وہ بھٹکتے پھر رہے ہیں
وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا	اور ایسے شخص کی بات نہ مان جس کے دل کو ہم نے اپنی
وَاتَّبَعَ هَوَاهُ (کہف - ۴)	یاد سے غافل کر دیا ہے اور جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی کی

(۹) وہ آیات جن میں بتایا گیا ہے کہ خدا ہی نے ان شیطانی ہستیوں کو انسان پر مسلط کیا ہے جو اس کو بہکاتی رہتی ہیں:

أَلَمْ تَرَ أَنَّا أَرْسَلْنَا الشَّيَاطِينَ عَلَى	دیکھتے نہیں ہو کہ ہم نے شیاطین کو ان کافروں کی طرف
الْكَافِرِينَ تَؤُزُّهُمْ أَزًّا (مریم - ۶)	چھوڑ دیا ہے اور وہ انھیں خوب بھڑکا رہے ہیں
وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَدْعُونَ إِلَى	اور ہم نے ان کو پیشوا بنا لیا ہے جو آگ کی طرف
النَّارِ (قصص - ۴)	دعوت دیتے ہیں۔
وَقَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَاءَ فَزَيَّنُوا لَهُمْ	اور ہم نے ان کے لئے مقرر کر دیئے ہیں ایسے ساتھی جو ان
مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ (حم السجدہ - ۳)	سامنے اور پیچھے کی چیزوں کو ان کیلئے خوشنما بناتے ہیں۔

متکلمین کی ناکامی

متکلمین اسلام کے ان دونوں گروہوں کی تقریریں دیکھنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ مسئلہ جبر و قدر کو حل کرنے میں دونوں کو ناکامی ہوئی ہے۔ مگر اس ناکامی کی وجہ یہ نہیں ہے کہ انھوں نے قرآن سے ہدایت حاصل کرنی چاہی تھی اور قرآن نے ان کی ہدایت نہیں کی بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے قرآن سے استفتا کرنے کے بجائے فلسفیانہ طریق پر فکر کی اور دو مقابل پہلوؤں میں سے ایک پہلو اختیار کر لیا پھر اپنے اعتقاد کی تائید میں دلائل ڈھونڈنے کے لئے قرآن مجید پر نگاہ ڈالی،

جو آیات اپنے موافق مطلب نظر آئیں ان کو لے لیا، اور جو آیات اپنے اعتقاد کے خلاف نظر آئیں ان کو تاویل کے خراد پر چڑھا دیا۔ دونوں فریقوں کی جانب سے جو آیات پیش کی گئی ہیں۔ ان کو آپ نے اوپر دیکھ لیا بعض آیات صریح قدر کا حکم لگاتی ہیں جن سے جبر کا پہلو نکالنا ممکن نہیں ہے، مگر جبریہ پھر بھی ان کی تاویل کرتے ہیں اور ایسے معنی پہناتے ہیں جن کو عقل سلیم کسی طرح قبول نہیں کرتی یہی حال قدریہ کا ہے۔ وہ جبر کا صریح حکم لگانے والی آیات کو قدر کے مطلب پر ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس میں ان کو یہ بھی خیال نہیں رہتا کہ آیت کے الفاظ کیا کہہ رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر گروہ کی بحثوں سے صرف وہی شخص مطمئن ہو سکتا ہے جو پہلے سے ایک عقیدہ قائم کر چکا ہو اور قرآن مجید سے صرف اس کی تائید چاہتا ہو۔ رہا وہ شخص جس نے خود پہلے سے کوئی رائے قائم نہ کی ہو اور جس کی خواہش یہ ہو کہ قرآن حکیم کے مطالعہ سے کسی نتیجہ تک پہنچے تو وہ جبریہ اور قدریہ کی بحثوں کو پڑھ کر ہرگز مطمئن نہیں ہو سکتا۔ بلکہ کچھ عجب نہیں کہ وہ خود قرآن مجید ہی کی طرف سے بدعقیدہ ہو جائے۔ اس لئے کہ جس طرح دونوں فرقوں نے آیات قرآنی کو لے کر ایک دوسرے سے ٹکرایا ہے اور ان سے دو بالکل متضاد عقیدوں پر استدلال کیا ہے اس کو دیکھ کر ایک ناواقف آدمی اس بدگمانی سے محفوظ نہیں رہ سکتا کہ خود قرآن مجید ہی کے بیانات میں معاذ اللہ تناقض و تعارض ہے۔

تحقیق مسئلہ

پچھلے صفحات میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اب تک انسان نے اس مسئلہ کو سمجھنے کی جتنی کوششیں کی ہیں وہ سب ناکام ہوئی ہیں۔ ان تمام ناکامیوں کی وجہ صرف ایک ہے، یعنی اُن ذرائع کا فقدان جن سے انسان اس وسیع کائنات کے نظام حکومت اور اس عظیم الشان سلطنتِ الٰہی کے دستورِ اساسی کو معلوم کر سکے۔ ہمارے سامنے ایک زبردست کارخانہ چل رہا ہے۔ ہم خود اس کارخانے کے کل پُرزوں میں سے ایک حقیر پرزہ ہیں اور اس کے دوسرے پرزوں کے ساتھ ہم بھی حرکت کر رہے ہیں۔ بس اتنا ہی ہم کو معلوم ہے۔ رہیں وہ قوتیں جو اس کارخانے کو چلا رہی ہیں، اور وہ قوانین جن کے ماتحت اس کے کام چل رہے ہیں، تو اُن تک رسائی حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ نہ ہمارے حواس وہاں تک پہنچ سکتے ہیں، اور نہ ہماری عقل اس کے اسرار کو پا سکتی ہے۔ احساس و ادراک سے ماوراء حقیقتوں کو چھوڑیئے، ہم نے تو ابھی تک کائنات کے ان مظاہر کا بھی پوری طرح احاطہ نہیں کیا ہے جو سرحدِ ادراک و احساس سے خارج نہیں ہے۔ جو کچھ ہم اپنے حواس سے محسوس کر سکے ہیں اور جو کچھ قیاس و استقراء کے ذریعہ سے کسی حد تک ہمارے علم میں آسکا ہے وہ مظاہرِ کائنات کے لامتناہی سمندر میں ایک قطرہ سے زیادہ نہیں ہے۔ گویا ہمارے علم اور وسائلِ علم کو ہمارے جہل اور اسبابِ جہل کے ساتھ وہی نسبت ہے جو متناہی کو لامتناہی کے ساتھ ہے۔ ایسی حالت میں یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں ہے کہ ہم اس کارخانے کے باطنی نظام اور اس میں اپنی صحیح پوزیشن کو سمجھ سکیں۔ ہمارا خود اپنے ذرائع علم سے اس کو سمجھنا تو درکنار اگر

خداوند تعالیٰ کی جانب سے ہمارے سامنے اس کو بیان کیا بھی جاتا تب بھی ہم اپنی محدود عقل سے اس کے معانی کو نہ سمجھ سکتے۔

اب ہمیں اصل سوال کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ سوال یہ تھا کہ قرآن میں مسئلہ جبر و قدر کی طرف جو اشارات کئے گئے ہیں ان میں بظاہر تناقض نظر آتا ہے کہیں بندے کو خود اپنے افعال کا فاعل قرار دیا گیا ہے اور اسی پر نیک و بد کی تمیز قائم کر کے جزا و سزا کی وعدہ وعید کی گئی ہے۔ کہیں بندے سے قدرتِ فعل کو سلب کر کے تمام افعال کی نسبت خدا کی طرف کر دی گئی ہے۔ کہیں ایک ہی فعل خدا اور بندے دونوں کی طرف منسوب کیا گیا ہے کہیں بندے کو ہدایت قبول کرنے اور ضلالت سے نکلنے کی دعوت اس طرح دی گئی ہے کہ گویا اس میں ترک و اختیار کی طاقت ہے۔ کہیں کہا گیا ہے کہ ہدایت و ضلالت خدا کی طرف سے ہے، خدا ہی گمراہ کرتا ہے اور خدا ہی سیدھے رستہ پر ڈالتا ہے کہیں بندہ کے لئے مشیت ثابت کی گئی ہے اور کہیں کہہ دیا گیا ہے کہ بندے کی مشیت کوئی چیز نہیں، اصل مشیت خدا کی ہے کہیں شرور و معاصی کو بندہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے، کہیں ان کا باعث شیطان کو قرار دیا گیا ہے، اور کہیں بتایا گیا ہے کہ خیر اور شر سب خدا کی طرف سے ہیں۔ کہیں کہا گیا ہے کہ خدا کے اذن کے بغیر کوئی کچھ نہیں کر سکتا، اور کہیں نافرمان انسانوں کو الزام دیا گیا ہے کہ انھیں خدا نے جو کچھ حکم دیا تھا انھوں نے اس کے خلاف کیا۔ اگر یہ باتیں باہم متناقض ہیں، جیسا کہ بظاہر نظر آتا ہے، تو ایسی کتاب کو ہم کتابِ الٰہی کیسے کہہ سکتے ہیں جس میں اتنی متناقض باتیں ہوں؟ اور اگر ان میں تناقض تسلیم نہیں کیا جاتا تو بتایا جائے کہ ان کے درمیان توفیق و تطبیق کی کیا سبیل ہے؟

امور ماوراء طبیعت کے بیان سے قرآن کا اصل مقصد

اس سوال پر غور کرنے سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ قرآن کریم میں نہ صرف مسئلہ جبر و قدر، بلکہ جملہ امور ماوراء طبیعت کی طرف جو اشارات کئے گئے ہیں ان کا اصل مقصد ان امور کی حقیقت بتانا اور اسرار الٰہی کے پردہ اٹھانا نہیں ہے

اس لئے کہ اول تو وہ بسیط حقیقتیں جو اس وسیع کائنات کے ورق ورق پر لکھی ہوئی ہیں اپنی تفصیلات کے ساتھ نہ کسی کتاب میں سما سکتی ہیں جسے انسان پڑھ سکتا ہو اور نہ کوئی انسانی بولی ان کے بیان کی متحمل ہو سکتی ہے۔ ان کے لئے لامتناہی دفتر چاہئیں، ان کو پڑھنے کے لئے ازلی وابدی زندگی درکار ہے، ان کو بیان کرنے کے لئے غیر ملفوظ عقلی کلام اور ان کو سننے کے لئے بے آواز عقلی سماع کی حاجت ہے۔

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا (کہف ۱۲)

اے پیغمبر ان سے کہو کہ اگر سمندر میرے پروردگار کے کلمات کو لکھنے کے لئے روشنائی بن جاتا تو وہ ان کے ختم ہونے سے پہلے ہی خرچ ہو جاتا، خواہ ہم ایک اور سمندر اسکی کمک کیلئے مدد دیتے۔

دوسرے اگر ان کو بیان بھی کیا جاتا، تو جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، انسان اپنے محدود قوائے ذہنی سے، جو اسے عطا کئے گئے ہیں، ان کو سمجھ نہ سکتا۔ انسان کی عقل کا حال یہ ہے کہ اگر ارسطو اور فیثاغورس کے زمانہ میں کوئی شخص بیسویں صدی عیسوی کے ٹیلیفون، سنیما، ریڈیو اور ہوائی جہاز کی تفصیلات بیان کرتا، تو سب سے پہلے وہی لوگ اس پر جنون کا حکم لگاتے جو آج تک سرآمد عقلاء سمجھے جاتے ہیں۔ اور اگر آج بیسویں صدی میں ان چیزوں کی کوئی تشریح کی جائے جو اب سے ہزار برس بعد دنیا میں ظاہر ہونے والی ہیں تو ہمارے بڑے سے بڑے فلسفی اور حکیم بھی اس کو نہ سمجھ سکیں گے۔ یہ ان چیزوں کا حال ہے جن کو جاننے اور سمجھنے کی استعداد انسان میں بالقوت موجود ہے اور فرق صرف قوت و فعل کا ہے مگر جن امور کو جاننے اور سمجھنے کی استعداد ہی سرے سے اس میں نہیں ہے، جو اس کے تصور میں کسی طرح سما ہی نہیں سکتے، ان کو بیان کرنے سے آخر کیا فائدہ مترتب ہو سکتا تھا؟ اسی لئے قرآن کہتا ہے کہ:۔

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (بقرہ ۳۴)

جو کچھ لوگوں کے سامنے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے سب کچھ وہ جانتا ہے مگر لوگ اسکی معلومات میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے بجز ان باتوں کے جن کا علم وہ خود ان کو بخشنا چاہے۔ اسکا اقتدار آسمانوں اور زمین سب پر چھایا ہوا ہے۔

پس اس قسم کے امور کی طرف قرآن میں جو اشارات کیے گئے ہیں وہ رازِ حقیقت بتانے کے لئے نہیں بلکہ ان مقاصد کو مدد پہنچانے کے لئے ہیں جن کا تعلق انسان کے اخلاقی اور عملی مفاد سے ہے۔ اگرچہ بعض مقامات پر ان کے ذریعہ سے حقیقت شناس نظر اور اعلیٰ روحانی بصیرت رکھنے والوں کو اسرارِ الٰہی کا بھی کچھ تھوڑا سا علم بخش دیا جاتا ہے، اور کہیں بیان کا سیاق اور موقع و محل کا اقتضا ایسے اشارات کی طرف بھی داعی ہو گیا ہے جن کو غور و تأمل اور فکرِ صحیح سے ہم تھوڑا بہت سمجھ سکتے ہیں۔

مسئلہ قضا و قدر کے بیان کا منشاء

اس سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ قضا و قدر کے مسئلہ پر جو اشارات کلام اللہ میں آئے ہیں ان کا اصل مقصد یہ نہیں کہ ہم سے وہ چیز بیان کی جائے جس کے سمجھنے کی قابلیت و استعداد ہم میں سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ اصل میں جو کچھ مقصود ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ انسان میں قناعت، یکسوئی، توکل علی اللہ، صبر و استقامت اور دنیوی طاقتوں سے بے خوفی پیدا کی جائے، اور اس میں ایسی اخلاقی قوت بھر دی جائے جس کی موجودگی میں مایوسی، پریشانی، خوف، حسد، رشک اور لالچ اس کے پاس پھٹکنے نہ پائیں، اور وہ اس قوت کے ذریعہ سے حق و صداقت اور نیکی کے طریق پر قائم رہے، اس کی طرف دوسروں کو دعوت دے، اس کے لئے سخت مشکلات کا مقابلہ کرے، اس کی راہ میں جتنی آزمائشیں پیش آئیں ان میں ثابت قدم رہے، نہ خدا کے سوا کسی کے مضرت پہنچنے کا اندیشہ کرے اور نہ کسی سے ذرہ برابر فائدہ کی امید رکھے، نہ بے سروسامانی میں ہمت ہارے نہ سروسامان پر بے جا اعتماد کرے، نہ زندگی کی ناکامیوں پر شکستہ خاطر ہو اور نہ کامیابیوں سے مخمور ہو کر سرکشی پر اتر آئے۔ مثال کے طور پر آیاتِ ذیل ملاحظہ ہوں جن سے اصل مقصود پر روشنی پڑتی ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللَّهِ
أَنْدَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ ۖ وَالَّذِينَ
آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ ۗ وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ

لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا ہمسر بناتے ہیں اور ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی خدا سے ہونی چاہئے۔ حالانکہ جو لوگ ایمان لانے والے

ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا (بقرہ-۲۰)

ہیں وہ سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔ کاش ظالموں کو وہ بات سوجھ جاتی جسے یہ عذاب سامنے دیکھ کر محسوس کرینگے کہ تمام قوت کا مالک صرف خدا ہے

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ (فاطر-۳)

لوگو! تم سب اللہ کے محتاج ہو اور دراصل بے نیاز اور ستودہ صفات تو اللہ ہی ہے

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا۔ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا (المزمل-۱)

اپنے پروردگار کا نام لے اور سب سے ٹوٹ کر اسی کا ہو جا۔ وہ مشرق اور مغرب سب کا مالک و مربی ہے، اس کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں، بس تو اسی کو اپنا کارساز بنالے

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ (بقرہ-۱۳)

کیا تو نہیں جانتا کہ آسمانوں اور زمین کی حکومت کا مالک خدا ہی ہے، اور اس کے سوا تم لوگوں کا کوئی حامی و مددگار نہیں ہے

اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ بَعْدِهٖ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (آل عمران-۱۷)

اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب آنیوالا نہیں ہے اور اگر وہ تم کو چھوڑ دے تو اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کرسکتا ہو؟ جو ایمان لانے والے ہیں ان کو تو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (آل عمران-۳)

کہو کہ خدایا، ملک کے مالک! تو جس کو چاہتا ہے حکومت دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے حکومت چھین لیتا ہے جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذلیل کردیتا ہے۔ بھلائی تیرے ہاتھ میں ہے تو یقیناً ہر چیز پر قادر ہے۔

قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ

کہو کہ فضیلت اللہ کے ہاتھ میں ہے جس کو چاہتا ہے

مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ (آل عمران - ۸)

عطا کرتا ہے اور وہ بہت کشادہ دست وصاحب علم ہے، اپنی رحمت کے لئے جس کو چاہے مخصوص کرلے۔

لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (الشوریٰ - ۳)

آسمانوں اور زمین کی کنجیاں اس کے ہاتھ میں ہیں، جسے چاہتا ہے کشادگی کے ساتھ رزق عطا کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ایک اندازہ سے نپا تلا دیتا ہے وہ ہر چیز کے حال سے خوب واقف ہے۔

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِى الرِّزْقِ (النحل - ۱۰)

اور اللہ ہی ہے جس نے تم کو رزق میں ایک دوسرے پر فضیلت دی ہے۔

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗ اِلَّا هُوَ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (یونس - ۱۱)

اگر اللہ تجھ کو نقصان پہنچائے تو اس کے سوا کوئی اس نقصان کو دور کرنے والا نہیں، اور اگر وہ تجھے فائدہ پہنچائے تو کوئی اس کے فضل کو پھیر دینے والا نہیں، اپنے بندوں میں سے وہ جس کو چاہتا ہے فائدہ پہنچاتا ہے، وہی بخشنے والا مہربان ہے۔

وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (بقرہ - ۱۲)

وہ اپنے جادو سے کسی کو خدا کے اذن کے بغیر نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا هُوَ مَوْلٰنَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (توبہ - ۷)

کہو کہ ہم کو ہرگز کوئی مصیبت نہیں آسکتی بجز اس کے جو اللہ نے ہمارے نصیب میں لکھدی ہے۔ وہی ہمارا مولیٰ ہے اور ایمان والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہئے۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا (آل عمران - ۱۵)

کوئی شخص اللہ کے اذن کے بغیر نہیں مرسکتا۔ موت کا وقت مقرر ہے، اور پہلے سے لکھا ہوا ہے۔

يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ

وہ کہتے ہیں کہ اگر تدبیر میں ہمارا بھی دخل ہوتا تو ہم یہاں

شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا قُل لَّوْ كُنتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلَىٰ مَضَاجِعِهِمْ (آل عمران - ۱۶)

نہ مارے جاتے۔ ان سے کہو اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے تب بھی جن لوگوں کے نصیب میں مارا جانا لکھ دیا گیا تھا وہ خود اپنی قتل گاہوں کی طرف نکل آتے۔

پس تقدیر پر عقیدہ رکھنے کی جو تعلیم قرآن حکیم میں دی گئی ہے اس کا اصل مقصود یہ ہے کہ انسان دنیا کی کسی طاقت کو نفع و نقصان کا مالک نہ سمجھے بلکہ صرف خدا ہی کو فاعل و موثر اور نافع و ضار سمجھے اور اپنے سب معاملات میں اسی پر بھروسہ کرے۔ اگر مصیبت آئے تو مایوس نہ ہو، خودداری کے اعلیٰ مقام سے نہ گرے، مخلوقات کے سامنے ذلت نہ اختیار کرے۔ اور اگر راحت میسر ہو تو اس پر پھولے نہیں، غرور و نخوت کو اپنے نفس میں جگہ نہ دے اور خدا کی زمین پر سرکشی و تکبر نہ اختیار کرے۔ یہی بات ہے جو سورۂ حدید (رکوع ۳) میں بیان کی گئی ہے:

مَا أَصَابَ مِن مُّصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِّن قَبْلِ أَن نَّبْرَأَهَا إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ لِّكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ

جو مصیبت بھی زمین میں آتی ہے، یا خود تم پر نازل ہوتی ہے وہ پیش آنے سے پہلے ہی ایک کتاب میں لکھی ہوئی ہے اور یہ اللہ کیلئے سہل سی بات ہے۔ تم کو یہ بات اسلئے بتا دی گئی کہ جو کچھ نقصان تم کو پہنچے اس پر دل شکستہ نہ ہو اور جو کچھ خدا تم کو عطا کرے اس پر اترا نہ جاؤ۔ اللہ کسی اکڑ نیوالے خود پسند کو دوست نہیں رکھتا

عقیدہ تقدیر کا فائدہ عملی زندگی میں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کی زندگی کے تمام معاملات میں یہی روح پھونکنے کی کوشش فرمایا کرتے تھے۔ کیونکہ اس سے اخلاق پر ایک خاص اثر پڑتا ہے۔ اگر لوگوں کے دلوں میں یہ چیز بیٹھ جائے تو بڑے بڑے تمدنی و سیاسی مسائل آپ سے آپ حل ہو جاتے ہیں، بلکہ پیدا ہی نہیں ہوتے۔ مثال کے طور پر دو حدیثیں ملاحظہ ہوں۔ حضرت ابوہریرہ رضؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

لَا یَحِلُّ لِامْرَأَةٍ تَسْأَلُ طَلَاقَ اُخْتِہَا لِتَسْتَفْرِغَ صَحْفَتَہَا فَاِنَّمَا لَہَا مَا قُدِّرَ لَہَا۔[۱]

کسی عورت کے لئے یہ حلال نہیں ہے کہ وہ اپنی دوسری بہن (یعنی سوکن) کو طلاق دینے کا مطالبہ اس خیال سے کرے کہ اس کے تمتعات اور حظوظ میں کوئی دوسرا شریک نہ رہے اور رزق کا پیالہ تنہا اس کے لئے خالی ہو جائے۔ اسلئے کہ بہر صورت اسکو وہی ملیگا جو اس کیلئے مقدر کر دیا گیا ہے۔

ایک دوسری حدیث میں ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک غزوہ میں بہت سی لونڈیاں ہمارے ہاتھ آئیں اور ہم نے ان سے تمتع کیا، مگر اس خیال سے کہ اولاد نہ ہو عزل[۲] کرنے لگے۔ پھر ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا حکم پوچھا۔ آپ نے سنتے ہی فرمایا:

اَوَ اِنَّکُمْ لَتَفْعَلُوْنَ؟

کیا واقعی تم ایسا کرتے ہو؟

یہی سوال آپ نے تین مرتبہ دہرایا، پھر فرمایا:

مَا مِنْ نَسَمَةٍ کَائِنَةٍ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ اِلَّا ھِیَ کَائِنَةٌ۔[۳]

قیامت کے دن تک جو بچے پیدا ہونے ہیں وہ تو پیدا ہو کر ہی رہیں گے۔

ان دونوں حدیثوں میں جن اصولوں کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے اگر ان کو وسعت کے ساتھ ہم اپنی زندگی کے معاملات میں استعمال کریں تو وہ معاشی کشمکش اور مزاحمت جس سے دنیا سے سکون و

۱۔ بخاری کتاب النکاح باب الشروط التی لا تحل فی النکاح۔ اسی کے قریب قریب بیہقی اور ابو نعیم اصبہانی نے دوسرے طریقوں سے نقل کیا ہے۔ علامہ ابن عبد البر لکھتے ہیں کہ اہل علم کے نزدیک یہ حدیث ان تمام احادیث میں سب سے بہتر ہے جو تقدیر کے مسئلہ میں منقول ہیں۔ اس کا منشا یہ ہے کہ اگر شوہر عورت کی بات مان بھی لے اور اس بیوی کو طلاق بھی دیدے جس کے متعلق وہ عورت یہ گمان کرتی ہے کہ وہ اس کے رزق میں شریک ہو جائے گی تب بھی اس تدبیر سے اس کو کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس کو صرف اتنا ہی حصہ ملے گا جتنا خدا نے اس کیلئے لکھ دیا ہے، خواہ شوہر اس کی شرط قبول کرے یا نہ کرے۔

۲۔ العزل النزع بعد الایلاج لینزل خارج الفرج ۳۔ بخاری کتاب النکاح باب العزل۔

چھین لیا ہے کس قدر جلد ختم ہو جائے۔ نہ کوئی کسی کو اپنے رزق کا چھیننے والا سمجھے اور نہ اپنے رزق کی حفاظت کے لئے کسی کی مزاحمت کرے، نہ سرمایہ دار اور مزدور کا سوال پیدا ہو اور نہ کسان و زمیندار کا، نہ کر دگرا در میسل زہار وف پیدا ہوں نہ لینن اور اسٹالین، نہ معاشی اور تمدنی مشکلات کو حل کرنے کے لئے اسقاطِ حمل اور منعِ حمل کی طرف رجوع کیا جائے اور نہ اللہ کے انتظام میں اصلاح کی کوشش کی جائے۔

یہ اور ایسے ہی بے شمار اخلاقی اور عملی فوائد ہیں جو قضا و قدر کی اسلامی تعلیم سے حاصل ہوتے ہیں۔ اور انہی فوائد کا حصول اصلی مقصود بھی تھا، مگر ہماری بد قسمتی کہ ہم نے اس کے عملی اور اخلاقی پہلو کو نظر انداز کر کے اپنی ساری توجہات فلسفیانہ پہلو کی طرف پھیر دیں اور اپنے مذاق طبیعت کے مطابق کلام اللہ اور کلام رسول سے ان مسائل فلسفہ کو حل کرنے لگے جو کلام الناس سے ہم نے اخذ کئے تھے۔ حالانکہ نہ قرآن مجید ہم کو مابعد الطبیعیات کی تعلیم دینے کے لئے اتارا گیا تھا، نہ رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ آپ فلسفہ کے پروفیسر کا کام انجام دیں اور نہ خدا اور رسول نے کبھی اس کو پسند کیا کہ ہم اپنی زندگی کے عملی معاملات کو چھوڑ کر ان مابعد الطبیعی مسائل میں الجھ جائیں جن سے دین و دنیا کا کوئی فائدہ حاصل ہونے والا نہیں ہے۔

تناقض کی تحقیق یہ مقدمہ ذہن نشین کر لینے کے بعد اب اس سوال کی طرف آئیے کہ قرآن مجید میں خاص تقدیر کے مسئلہ سے بحث کئے بغیر جو مختلف اشارات ضمناً دوسرے مباحث کے سلسلہ میں اس کی جانب کئے گئے ہیں آیا ان میں حقیقتاً کوئی تناقض ہے بھی یا نہیں؟

اگر کسی شے کو مختلف علتوں کی جانب منسوب کیا جائے تو اس پر تناقض کا حکم صرف اس صورت میں لگایا جا سکتا ہے جب کہ اس کی صرف ایک ہی علت ہو لیکن اگر اس کی متعدد علتیں ہوں تو ایسی صورت میں اس کو کبھی ایک علت کی جانب اور کبھی دوسری علت کی جانب نسبت دینے میں

کوئی تناقض نہ ہوگا مثلاً اگر ہم کبھی یہ کہیں کہ کاغذ کو پانی نے تر کر دیا اور کبھی یہ کہ اُسے آگ نے تر کیا اور کبھی یہ کہ اسے مٹی نے تر کیا تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ تم نے متناقض باتیں کہی ہیں کیونکہ کاغذ کی تری ایک ہی علت کی طرف منسوب ہوسکتی ہے لیکن اگر ہم کبھی یہ کہیں کہ ملک کو بادشاہ نے فتح کیا، اور کبھی یہ کہ ملک کو سپہ سالار نے فتح کیا اور کبھی یہ کہ اسے فوج نے فتح کیا اور کبھی یہ کہ اُسے سلطنت نے فتح کیا، اور کبھی اس فتح کو فرداً فرداً ہر سپاہی کی طرف منسوب کریں، تو ان مختلف اقوال پر تناقض کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ اس لئے کہ یہ فتح کا واقعہ مجموعی طور پر ان سب کی طرف بھی منسوب ہو سکتا ہے اور ایک ایک وجہ سے ان علتوں میں سے ہر علت کی طرف بھی۔

پھر اگر کسی شئے میں متعدد علتوں کی تاثیرات اس طرح خلط ملط ہوں کہ مخاطب کی عقل کسی طور سے اس کے اندر ہر علت کی تاثیر کو جدا جدا کر کے ہر ایک کا حصہ الگ الگ متعین نہ کر سکتی ہو، اور نہ ایسے کسی تجزیہ وتحلیل اور اس طرح کے کسی حساب کو سمجھ سکتی ہو، تو اس صورت میں متکلم کے لئے صحیح انداز بیان یہی ہو سکتا ہے کہ وہ اجمال کے طور پر اس کو ایک ایک علت کی طرف منسوب کرے، اور مخاطب اگر کسی غلط فہمی کی بنا پر اس شئے کو صرف ایک ہی علت کی جانب نسبت دے رہا ہو تو اس کی تردید کر دے۔ مثال کے طور پر اسی فتح کے واقعہ کو لیجئے۔ اس میں بادشاہ، سپہ سالار، فوج، سلطنت اور فرداً فرداً ہر سپاہی کی قوتیں شریک ہیں، مگر وہ اس طرح باہم ملی جلی ہیں کہ ہم کسی تجزیہ وتحلیل اور کسی حساب سے یہ معلوم نہیں کر سکتے کہ اس واقعہ کے اندر ہر ایک کا حصہ کس قدر ہے اس لئے زیادہ صحیح یہ ہوگا کہ اس واقعہ کو ان میں سے ہر ایک کی طرف بر سبیل اجمال نسبت دی جائے اور اگر کوئی شخص ان میں سے محض کسی ایک کی طرف اس کو حصر وتعیین کے طور پر منسوب کر رہا ہو تو کہہ دیا جائے کہ اس کا قول غلط ہے

یہی حال انسان کے افعال کا ہے۔ ہر فعل جو انسان سے سرزد ہوتا ہے اس میں متعدد اسباب شامل ہوتے ہیں، اور اس کے ظہور وصدور میں ہر سبب کا کچھ نہ کچھ حصہ ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر میں اس وقت لکھ رہا ہوں۔ میرے اس فعل کتابت کا تجزیہ کیجئے تو اس میں اسباب کا ایک پورا سلسلہ آپ کو نظر آئے گا۔ مثلاً لکھنے کے لئے میرا اختیار و ارادہ، میرے اندر جو بے شمار ذہنی اور جسمانی قوتیں موجود ہیں ان سب کا اس ارادے کے تحت کام کرنا، اور خارجی قوتوں کا، جو بے حد و حساب ہیں اور جن میں سے بہت سی قوتیں میرے علم میں بھی نہیں ہیں، میری مساعدت کرنا۔

پھر ان اسباب کی الگ الگ تحلیل کیجئے۔ یہ بے شمار خارجی قوتیں جو اس وقت اس فعل میں میری مساعدت کر رہی ہیں ان میں سے کسی کو بھی نہ میں نے بنایا ہے، نہ فراہم کیا ہے، نہ میں ان پر اتنی قدرت رکھتا ہوں کہ انھیں اپنی مساعدت پر مجبور کر سکوں۔ وہ خدا ہی ہے جس نے ان کو اس طور پر بنایا اور اس طرح فراہم کر دیا ہے کہ جب میں لکھنے کا ارادہ کرتا ہوں تو یہ ساری قوتیں میری مساعدت کرنے لگتی ہیں، اور اگر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ میری مساعدت نہ کریں تو میں نہیں لکھ سکتا۔

اسی طرح جب میں خود اپنے اوپر نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میرا موجود اور زندہ ہونا، میرا احسنِ تقویم پر ہونا، میرے جسم کے ان اعضاء کا جو کتابت کے فعل میں حصہ لیتے ہیں صحیح و سلامت ہونا، میرے اندر ان طبیعی قوتوں کا موجود ہونا جن سے میں اس فعل میں کام لیتا ہوں، اور میرے دماغ میں حافظہ، تفکر، علم اور دوسری بہت سی چیزوں کا پایا جانا، ان میں سے کوئی شے بھی نہ میری کاریگری کا نتیجہ ہے، نہ میرے اختیار میں ہے۔ ان سب کو بھی اسی خدا نے اس طور پر بنایا ہے کہ جب میں لکھنے کا ارادہ کرتا ہوں تو یہ سب چیزیں میرا ساتھ دیتی ہیں، اور اگر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک شے میرا ساتھ نہ دے تو میں کتابت کے فعل میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

رہا میرا اختیار و ارادہ تو اس کی حقیقت بھی میں نہیں جانتا۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ پہلے کچھ

خارجی اسباب اور کچھ باطنی اسباب سے میرے اندر لکھنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ پھر میں غور کرتا ہوں کہ لکھوں یا نہ لکھوں۔ پھر دونوں پہلوؤں کے درمیان موازنہ کرنے کے بعد میں لکھنے کے پہلو کو اختیار کرتا ہوں۔ اور جب میلان فعل کی جانب قوی ہو جاتا ہے تو میں فعل کا ارادہ کر کے اپنے اعضاء کو اس کے لئے حرکت دیتا ہوں۔ اس خواہش سے لے کر اقدام فعل تک جتنی چیزیں ہیں ان میں سے کسی چیز کا بھی میں خالق نہیں ہوں، بلکہ مجھے اب تک یہ بھی پوری طرح معلوم نہیں ہو سکا ہے کہ خواہش اور اقدام فعل کے درمیان کتنی باطنی قوتیں کام کرتی ہیں، اور اس کام میں ان کا کتنا حصہ ہے۔ مگر یہ بات وجدانی طور پر میں اپنے اندر پاتا ہوں کہ خواہش اور اقدامِ فعل کے درمیان کوئی مقام ایسا ضرور ہے جہاں میں فعل اور ترک فعل میں سے کسی ایک چیز کو آزادانہ اختیار کرتا ہوں اور جب میں آزادی کے ساتھ کسی ایک پہلو کو اختیار کر لیتا ہوں تو مجھے یہ قدرت اپنے اندر محسوس ہوتی ہے کہ جس پہلو کو میں نے اختیار کیا ہے اس کے لحاظ سے اپنے وسائلِ داخلی اور اسبابِ خارجی کو استعمال کروں میں اپنے اس اختیار اور آزادی ارادہ کو کسی دلیل سے ثابت نہیں کر سکتا۔ مگر کوئی دلیل میرے اور کسی انسان کے ذہن سے اس وجدانی احساس کو دور نہیں کر سکتی۔ حتیٰ کہ جو شخص انتہا درجہ کا جبریہ ہے اس کا وجدان بھی اس احساس سے خالی نہیں ہے، خواہ وہ اپنے فلسفیانہ مسلک کی خاطر کتنی ہی شدت کے ساتھ اس کا انکار کرتا ہو۔

اس تقریر سے معلوم ہوا کہ فعل کتابت کے صدور میں جتنے اسباب و علل کام کرتے ہیں ان کو تین جدا جدا سلسلوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

١- وہ خارجی اور داخلی اسباب جن کا فراہم ہونا کتابت کا ارادہ کرنے سے پہلے ضروری ہے

٢- میرا کتابت کو اختیار کر کے اُس کا ارادہ کرنا۔

٣- وہ خارجی اور داخلی اسباب جن کی مساعدت کے بغیر لکھنے کے فعل کا صادر ہونا ممکن نہیں ہے

ان تینوں سلسلوں میں سے پہلے اور تیسرے سلسلہ میں جتنے اسباب ہیں اُن کے متعلق تو اوپر کہا جاچکا ہے کہ اُن کو خدا نے فراہم کیا اور سازگار بنایا ہے اور ان میں سے کسی پر بھی میری کو منت نہیں ہے اس لیے ان کے اعتبار سے میرا فعل کتابت خدا ہی کی طرف منسوب ہوگا جس کی توفیق اس کام میں میرے شامل حال ہوئی ہے۔ رہی بیچ کی کڑی تو وہ ایک لحاظ سے میری طرف منسوب ہوگی کیونکہ وہاں میں نے ایک طرح کا ارادہ اختیار و ارادہ استعمال کیا ہے۔ اور ایک پہلو سے وہ خدا کی طرف منسوب ہوگی۔ جس نے اپنی مقرر کردہ حدود کے اندر مجھ میں یہ قوت پیدا کی کہ ارادہ کروں اور آزادی کے ساتھ اپنا اختیار استعمال کروں

یہ تو تھا مجرد فعل کا حال جو اپنی حقیقت میں بجز ایک حرکت کے اور کچھ نہیں ہے لیکن انسانی افعال بعض اضافی اور اعتباری حیثیتوں سے اپنے اندر دو پہلو رکھتے ہیں۔ ایک خیر کا پہلو اور دوسرا شر کا پہلو۔ مجرد فعل پر نہ خیر کا حکم لگایا جا سکتا ہے اور نہ شر کا۔ البتہ انسان کی نیت اس کو شر بھی بنا سکتی ہے اور خیر بھی (اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ) مثال کے طور پر میں راستے میں ایک اشرفی پڑی ہوئی دیکھتا ہوں اور اسے اٹھا لیتا ہوں۔ میرا اس کو اٹھا لینا محض ایک حرکت ہے جو نیک و بد دونوں حیثیتوں سے خالی ہے لیکن اگر اس اٹھا لینے کے فعل میں میری نیت یہ ہے کہ میں دوسرے کے مال سے بلا کسی حق کے خود فائدہ اٹھاؤں تو یہ شر ہے۔ اور اگر میری نیت یہ ہے کہ اس کے مالک کو تلاش کرکے اسے واپس دے دوں تو یہ خیر ہے صورت اول میں میری نیت کے ساتھ ایک اور قوت کی تحریک بھی شامل ہوگی جس کو شیطان کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اور میرا یہ فعل تینوں علتوں کی طرف منسوب ہوگا۔ ایک خدا، دوسرا شیطان، تیسرا خود میں۔ صورت دوم میں اس فعل کی نسبت دو علتوں کی جانب ہوگی ایک خدا دوسرا میں۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہم ہر انسانی فعل کو دو یا تین علتوں کی طرف منسوب کرسکتے ہیں مگر

یہ کسی طرح ہماری سمجھ میں نہیں آسکتا کہ فعل میں ان دونوں علتوں کی تاثیر کس کس مقدار میں ہے خصوصاً یہ حساب اس حیثیت سے اور بھی پیچیدہ ہوجاتا ہے کہ ان تاثیرات کا تناسب تمام انسانوں کے افعال میں یکساں نہیں ہے بلکہ ہر انسان کے فعل میں جداگانہ ہے۔ اس لئے کہ ہر انسان کے اندر اس کے آزادانہ اختیار اور اس کی مجبوریوں کی مقدار میں مختلف ہوتی ہیں۔ کوئی مبداء فیاض سے زیادہ زبردست قوت تمیز، زیادہ صحیح قوت فیصلہ، ملکوتیت کی جانب زیادہ قوی میلان، اور شیطانی وساوس کا مقابلہ کرنے کی زیادہ طاقت لے کر آیا ہے، اور کوئی کم۔ اور اسی کمی و زیادتی پر جس کا تناسب ہر شخص کے اندر مختلف ہے، افعال میں انسان کی شخصی ذمہ داری کے کم یا زیادہ ہونے کا انحصار ہے۔ ایسی حالت میں یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں ہے کہ افعال میں انسان، خدا، اور شیطان کی تاثیرات کا کوئی ایسا تناسب بتایا جاسکے جو عمومیت کے ساتھ تمام انسانی افعال میں پایا جاتا ہو۔

پس جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جاچکا ہے، انسانی افعال کو ان کی علتوں کی طرف نسبت دینے کی صحیح صورت بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ اجمالی طور پر ان کو یا تو بیک وقت تمام علتوں کی طرف منسوب کیا جائے، یا کبھی ایک علت کی جانب اور کبھی دوسری کی جانب، اور اگر کوئی شخص غلط فہمی سے ان کو صرف ایک علت کی طرف نسبت دے کر دوسری علتوں کی نفی کرتا ہو تو اس کی تردید کردی جائے ٹھیک یہی طریقہ ہے جو قرآن مجید میں اختیار کیا گیا ہے۔ اگر آپ ان اشارات کا تتبع کریں جو قرآن مجید میں مسئلہ جبر و قدر کی طرف کئے گئے ہیں تو ان کو حسب ذیل عنوانات کے تحت مرتب کرسکتے ہیں۔

(۱) تمام امور کی نسبت خدا کی طرف:

وَإِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَقُولُوا	اگر انھیں کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ خدا
هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ج وَإِنْ تُصِبْهُمْ	کی طرف سے ہے اور اگر برائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں

سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ؕ قُلْ	یہ تیری طرف سے ہے۔ کہو سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے
كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ	پھر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ کوئی بات نہیں
لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ۔ (النساء - ۱۱)	سمجھتے۔
وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا	اور اگر اللہ تجھے کوئی نقصان پہنچائے تو اسے دور
كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ؕ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ	کرنے والا اس کے سوا کوئی نہیں اور اگر تجھے نفع
فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (انعام - ۲)	پہنچائے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے۔
فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ	پس اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے
مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (ابراہیم - ۱)	چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور وہ سب پر غالب اور دانا ہے
وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا	نہیں حاملہ ہوتی کوئی مادہ اور نہ بچہ جنتی ہے مگر وہ اللہ
بِعِلْمِهٖ ؕ وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ	کے علم میں ہوتا ہے اور نہیں دراز ہوتی کسی کی عمر اور نہ
مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ ؕ (فاطر - ۲)	کم ہوتی ہے مگر وہ ایک کتاب میں لکھی ہوئی ہے۔
لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	آسمانوں اور زمین کی کنجیاں اس کے قبضہ میں ہیں جس کے
يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ اِنَّهٗ	لئے چاہتا ہے رزق کشادہ کرتا ہے اور جس کے لئے چاہتا
بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (الشوریٰ - ۲)	ہے نپا تلا کر دیتا ہے، وہ ہر چیز سے واقف ہے۔
وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ	اگر اللہ اپنے بندوں کیلئے رزق کشادہ کر دیتا تو وہ زمین
لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ	پر سرکش ہو جاتے مگر وہ ایک اندازہ سے نازل کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔
مَّا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ (الشوریٰ - ۳)	وہ اپنے بندوں کے حال سے واقف ہے اور سب کچھ دیکھ رہا ہے۔

(۲) فعل کی نسبت بندے کی طرف :

اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى	یہ کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (النجم ۳)

اور یہ کہ انسان کے لئے کچھ نہیں ہے مگر جس کی وہ سعی کرے

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (بقرہ ۴

اللہ کسی نفس کو مکلف نہیں کرتا مگر اسکی قدرت کے لحاظ سے جو کچھ اس نے کمایا اس کا فائدہ اسی کیلئے ہے اور جو گناہ اس نے سمیٹا اس کا وبال بھی اسی پر ہے

اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (مزمل ۱)

یہ تو ایک یاددہانی ہے، پھر جس کا جی چاہے اپنے رب کا راستہ لے لے۔

(۳) فعل خیر کی نسبت بندے کی طرف؛

وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ (آل عمران ۶)

رہے وہ لوگ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں تو اللہ ان کے پورے اجر انہیں دے گا اور وہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔

اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۭ وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ (فاطر ۳)

تم بہرحال انہی لوگوں کو متنبہ کرسکتے ہو جو اپنے خدا سے بے دیکھے ڈرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں، جو شخص پاکیزگی اختیار کرتا ہے اپنے ہی لئے کرتا ہے، اور سب کو خدا کی طرف پلٹنا ہے۔

وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (الزمر ۴)

اور جو شخص سچائی لایا اور جس نے سچائی کو مانا ایسے ہی لوگ پرہیزگار ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (احقاف ۲)

جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے ایسے لوگوں کے لئے کسی خوف اور رنج کا مقام نہیں۔

(۴) فعل شر کی نسبت خدا کی طرف۔

اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ

کیا تم چاہتے ہو کہ جسے اللہ نے گمراہ کر دیا ہے اسے تم

اَضَلَّ اللّٰهُ ط وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِیْلًا (النساء-۲)

راستہ دکھاؤ؟ حالانکہ جسے اللہ نے گمراہ کر دیا اسکے لئے تم ہرگز راستہ نہیں پا سکتے۔

وَمَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَیْئًا ط اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ لَمْ یُرِدِ اللّٰهُ اَنْ یُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ ط (مائدہ-۶)

جسے اللہ نے فتنہ میں ڈالنے کا ارادہ کر لیا ہو اسے تم اللہ سے کچھ بھی نہیں بچا سکتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ ہی نے پاک کرنا نہ چاہا۔

وَمَنْ یُّرِدْ اَنْ یُّضِلَّهٗ یَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَیِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا یَصَّعَّدُ فِی السَّمَآءِ ط كَذٰلِكَ یَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ (الانعام-۱۵)

اور جسے اللہ گمراہ کرنے کا ارادہ کرے اس کے سینے کو ایسا تنگ کرتا ہے گویا وہ آسمان میں چڑھا جا رہا ہے۔ اس طرح اللہ ناپاکی کو ان لوگوں پر ڈالتا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔

وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ یَّفْقَهُوْهُ وَفِیْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ط وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِی الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا (بنی اسرائیل-۵)

اور ہم نے ان کے دلوں پر غلاف چڑھا دیے ہیں جن کی وجہ سے وہ اس کلام کو نہیں سمجھتے اور ان کے کانوں میں گرانی پیدا کر دی ہے۔ اور ان کا حال یہ ہے کہ جب تم قرآن میں اکیلے اللہ کا ذکر کرتے ہو تو وہ نفرت سے منہ پھیر لیتے ہیں

(۵) ضلِ شر کی نسبت شیطان کی طرف:

اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَیَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ (بقرہ-۳۷)

شیطان تمہیں مفلسی سے ڈراتا ہے اور تم کو شرمناک افعال کا حکم دیتا ہے۔

وَزَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِیْلِ فَهُمْ لَا یَهْتَدُوْنَ (النمل-۲)

اور شیطان نے ان کے برے اعمال کو ان کے لئے خوشنما بنا دیا اور انہیں راہ راست سے روک دیا اس وجہ سے وہ راستہ نہیں پاتے۔

(۶) فعل شر کی نسبت بندوں کی طرف :-

وَمَا اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ (النساء-۱۱)

اور ہر برائی جو تمھیں پیش آتی ہے وہ تمھاری اپنی وجہ سے ہوتی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (بقرہ-۱)

حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں نے حق کو ماننے سے انکار کر دیا ہے اب ان کے لئے یکساں ہے خواہ تم انہیں ڈراؤ یا نہ ڈراؤ وہ ماننے والے نہیں۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (بقرہ ۴)

اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری نشانیوں کو جھٹلایا وہ اہل دوزخ ہیں جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (حٰم السجدہ ۲)

رہے ثمود تو ہم نے انھیں راستہ دکھایا مگر انھوں نے اندھے بن کر چلنے کو سیدھی راہ اختیار کرنے پر ترجیح دی پس ایک زبردست کڑکے نے انھیں آ لیا جس میں ذلت کی سزا تھی اور یہ انکی بری کمائی کا نتیجہ تھا

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ ؕ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (التحریم ۱)

اے وہ لوگو جنھوں نے کفر کیا تھا آج معذرتیں پیش کرو تم کو وہی بدلہ تو دیا جائے گا جیسے تم عمل کرتے تھے۔

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا (الفجر)

ہرگز نہیں بلکہ تم یتیم کو عزت نہیں دیتے اور مسکین کو کھانا کھلانے پر ایک دوسرے کو نہیں ابھارتے اور مردوں کی میراث حق ناحق کھاتے ہو اور مال کی محبت میں سخت حریص ہو۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (الزلزال-۱)

اور جس نے ذرہ برابر برائی کی وہ اسے دیکھ لیگا۔

(۷) خیر کی ابتدا انسان کی جانب سے اور تکمیل خدا کی جانب سے :

قُلْ اِنَّ اللّٰہَ یُضِلُّ مَنْ یَّشَآءُ وَ
یَھْدِیْٓ اِلَیْہِ مَنْ اَنَابَ (الرعد-۴)

کہو اللہ گمراہ کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور اپنی طرف آنے کا
راستہ بتاتا ہے صرف اس شخص کو جو اس کی طرف رجوع کرے۔

(۸) شر کی ابتدا انسان کی جانب سے اور تکمیل خدا کی جانب سے:

وَمَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ
مَا تَبَیَّنَ لَهُ الْھُدٰی وَیَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ
الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰی (النساء-۱۷)

اور جو کوئی ہدایت کے واضح ہو جانے کے بعد رسول کی مخالفت
کرے اور اہل ایمان کی راہ کے بجائے دوسری راہ چلے تو اسے
ہم اسی راستے پر موڑ دیتے ہیں جس پر وہ خود مڑ گیا۔

(۹) پھر جہاں انسان نے اپنے گناہ کی ذمہ داری خدا پر ڈال کر خود بری الذمہ ہو جانا چاہا وہاں اسکی تردید کر دی گئی۔

وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰھُمْ
مَا لَھُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ ھُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ (الزخرف-۲)

اور انھوں نے کہا کہ اگر رحمن چاہتا تو ہم ان فرشتوں کی پرستش نہ کرتے لیکن ان کو
اس معاملہ (مشیت الٰہی) کا کوئی علم نہیں ہے وہ محض اٹکل سے یہ باتیں کہتے ہیں

وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا
اٰبَآءَنَا عَلَیْھَا وَاللّٰہُ اَمَرَنَا بِھَا قُلْ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَاْمُرُ
بِالْفَحْشَآءِ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ؟

اور جب کبھی انھوں نے کوئی برا کام کیا تو کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی
کرتے پایا ہے اور اللہ نے ہم کو اس کا حکم دیا ہے۔ اے پیغمبر ان سے کہو کہ اللہ بری
باتوں کا حکم نہیں دیتا کیا تم اللہ کے بارے میں ایسی باتیں کہتے ہو جن کا علم تم کو نہیں ہے۔

(۱۰) اور جہاں انسان نے اپنی ہی تدبیر کو سب کچھ سمجھا اور تقدیر الٰہی کا انکار کیا وہاں اس کی بھی تردید کر دی گئی:

یَقُوْلُوْنَ لَوْ کَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ
مَّا قُتِلْنَا ھٰھُنَا قُلْ لَّوْ کُنْتُمْ فِیْ بُیُوْتِکُمْ
لَبَرَزَ الَّذِیْنَ کُتِبَ عَلَیْھِمُ الْقَتْلُ اِلٰی
مَضَاجِعِھِمْ (آل عمران-۱۶)

وہ کہتے ہیں اگر معاملات کے طے کرنے میں ہمارا بھی کچھ حصہ ہوتا تو
ہمارے آدمی یہاں (میدان جنگ میں) نہ مارے جاتے۔ اے پیغمبر
ان سے کہو کہ اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن کے لئے مارا جانا
لکھ دیا گیا ہے وہ اپنے مرنے کی جگہ پر خود جا پہنچتے۔

حقیقت کی پردہ کشائی

پچھلی بحث سے یہ بات تو صاف ہوگئی کہ قرآن مجید میں مسئلہ جبر وقدر کے متعلق جو اشارات مختلف مواقع پر کئے گئے ہیں ان میں درحقیقت کوئی تناقض وتعارض نہیں ہے۔ لیکن ایک سوال پھر بھی باقی رہ گیا، اور وہ یہ ہے کہ مخلوقاتِ عالم میں انسان کی وہ کونسی امتیازی حیثیت ہے جس کے لحاظ سے ایک طرف تو وہ تمام موجودات کی طرح خدا کا محکوم ہے، قوانین خداوندی میں جکڑا ہوا ہے، بندہ ہے، مجبور ہے، اور دوسری طرف اپنے افعال میں مختار بھی ہے، اپنے اعمال کا ذمہ دار بھی ہے، اپنی حرکات وسکنات کے لئے جوابدہ بھی ہے، جزاوسزا کا مستحق بھی ہے؟ نیز جب انسان کا حال یہ ہے اور اس کی زندگی میں جبر واختیار اسی طرح ملے جلے ہیں، تو عدل کیونکر ممکن ہے؟ اسلئے کہ صحیح انصاف کے ساتھ جزاوسزا کا فیصلہ کرنا بغیر اس تحقیق کے ممکن نہیں ہے کہ انسان کے افعال کی ذمہ داری خود اس پر کس حد تک ہے، اور ذمہ داری کی تشخیص بغیر یہ معلوم کئے نہیں ہوسکتی کہ اس کے افعال میں اس کے آزادانہ اختیار کا کتنا حصہ ہے۔ اس مسئلہ کی تحقیق کے لئے جب ہم قرآن مجید پر نظر ڈالتے ہیں تو اس سے ہم کو ایک ایسا تشفی بخش جواب ملتا ہے جو دنیا کی کسی دوسری کتاب۔ اور دنیا کے کسی انسانی علم وفن سے نہیں ملتا۔

مخلوقات میں انسان کی امتیازی حیثیت

قرآن ہمیں خبر دیتا ہے کہ انسان کی پیدائش سے پہلے کائنات میں مخلوقات کی جتنی انواع موجود تھیں وہ سب اپنی فطرت کے لحاظ سے اطاعت کیش واقع ہوئی تھیں[۱]۔ اختیار وارادہ کی قوت سرے سے ان کو دی ہی نہیں گئی تھی۔ ان کا کام صرف

۱؎ اس کلیہ سے صرف جن مستثنیٰ ہیں جن کا مسئلہ یہاں زیر بحث نہیں ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوں کی زندگی میں بھی جبر واختیار کی آمیزش ہے اور ان کے اعمال کا ایک حصہ ایسا ہے جس میں وہ مختار اور جواب دہ ہیں، لیکن بہرحال وہ ان خصوصیات کے حامل نہیں ہیں جن کی بنا پر انسان کو زمین کی خلافت دی گئی ہے۔

یہ تھا کہ جس کے سپرد جو خدمت کردی گئی اس کو وہ ایک قانون اور ایک نظام کے مطابق، ذرہ برابر سرکشی کئے بغیر بجا لاتا ہے۔ ان میں سب سے افضل مخلوق فرشتے تھے جن کے متعلق حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَا اَمَرَھُمْ وَ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ (الشعراء-۱)

جو کچھ اللہ ان کو حکم دیتا ہے اور ان کی وہ نافرمانی نہیں کرتے اور جو ان کو حکم دیا جاتا ہے اس کی تعمیل کرتے ہیں۔

اسی طرح اجرام فلکی کی عظیم الشان ہستیاں تھیں جن کا حال یہ تھا:

وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّھَا ذٰلِکَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰہُ مَنَازِلَ حَتّٰی عَادَ کَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ لَا الشَّمْسُ یَنْبَغِیْ لَھَا اَنْ تُدْرِکَ الْقَمَرَ وَلَا الَّیْلُ سَابِقُ النَّھَارِ وَکُلٌّ فِیْ فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ (یٰسٓ-۳)

سورج اپنے مستقر کی طرف چلا جا رہا ہے۔ یہ ایک زبردست صاحب علم کا ٹھیرایا ہوا اندازہ ہے۔ اور چاند کی منزلیں ہم نے مقرر کر دی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اپنی پہلی کی طرف پلٹ آتا ہے۔ نہ سورج کی یہ مجال کہ چاند کو جا پکڑے۔ نہ رات کی یہ مجال کہ دن سے پہلے آجائے سب ایک فلک میں تیر رہے ہیں۔

یہی حال آسمان و زمین کی دوسری مخلوقات کا تھا کہ:

کُلٌّ لَّہٗ قٰنِتُوْنَ (الروم-۳)

سب اس کے تابع فرمان ہیں۔

لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِہٖ وَلَا یَسْتَحْسِرُوْنَ یُسَبِّحُوْنَ الَّیْلَ وَالنَّھَارَ لَا یَفْتُرُوْنَ (انبیاء-۲)

اپنے رب کی بندگی سے نہ سرکشی کرتے ہیں نہ تھکتے ہیں۔ شب و روز جاری ہیں دوڑ رہے ہیں ذرا دم نہیں لیتے۔

پھر اللہ نے چاہا کہ اپنی بنائی ہوئی مخلوقات میں سے کسی کو اپنی وہ امانت سپرد کر دے جو اس وقت تک کسی کو نہ دی گئی تھی چنانچہ اس نے وہ امانت آسمان و زمین کی مخلوقات میں سے ایک ایک کے سامنے پیش کی اور ہر ایک نے زبان حال سے اپنی ناقابلیت اور اپنے عدم تحمل کا اقرار کیا۔

آخرکار اللہ نے اپنی تخلیق کا جدید ترین ایڈیشن نکالا جس کا نام انسان ہے اور اس نے بڑھ کر وہ بارِ امانت اٹھالیا جس کے اٹھانے کی صلاحیت اور ہمت کسی دوسری مخلوق میں نہ تھی،

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ	ہم نے اس امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے آگے
وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا	پیش کیا مگر انھوں نے اسے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈرے
وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ	مگر انسان نے اسے اٹھالیا یقیناً وہ اپنے اوپر ظلم کرنے والا اور نادان ہے کہ اتنا
كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (احزاب-۹)	بڑا بارِ امانت اٹھا کر اس کی ذمہ داری محسوس نہیں کرتا،

یہ امانت کیا تھی؟ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ علم، قدرت، اختیار، ارادہ اور فرمانروائی کا پرتو جو اسوقت تک کسی مخلوق پر نہ ڈالا گیا تھا، جس کے قبول کرنے کی صلاحیت نہ فرشتوں میں تھی، نہ اجرام فلکی میں نہ پہاڑوں میں، نہ زمین و آسمان کی کسی مخلوق میں۔ وہ صرف انسان تھا جو اپنی فطرت کے لحاظ سے اس پرتو کا متحمل ہو سکتا تھا اس لئے اس نے یہ بارِ امانت اٹھالیا۔ اور اسی لئے وہ اللہ کی خلافت و نیابت کے منصب پر سرفراز ہوا۔ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (بقرہ-۴)۔ اس بارِ امانت کے حامل، اس خلیفۃ اللہ فی الارض کی امتیازی خصوصیت، جس کی بنا پر یہ دوسری تمام مخلوقات سے ممتاز ہو گیا ہے، یہ ہے کہ وہ طبعاً اطاعت کیش نہیں بنایا گیا ہے[1]۔ اس کو عام مخلوقات کی طرح نظامِ کلّی کے تحت قوانین و حدودِ الٰہیہ کا پابند بنانے کے ساتھ ایک ایسی قوت بھی عطا کی گئی ہے جس کی وجہ سے وہ بخلاف دوسری مخلوقات کے ایک خاص دائرہ میں مجبورانہ اطاعت سے آزاد ہے اور اتنا اختیار رکھتا ہے کہ چاہے اطاعت کرے اور چاہے سرکشی و نافرمانی کرنے لگے۔ یہ ایسا فرق ہے جو کلامِ الٰہی میں تدبر کرنے والے

---

[1] یہ بات متعدد آیاتِ قرآنی سے ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا (یونس-۱۰) اور وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا (انعام-۱۳) وغیرہ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا خود یہ نہیں چاہتا تھا کہ انسان کو بجبر شرک سے روکے اور ایمان پر مجبور کرے۔

کو صاف نظر آتا ہے۔ قرآن مجید میں آپ کو انسان کے سوا کسی اور ایسی مخلوق کا نشان نہ ملے گا جس کی طرف اطاعت اور عصیان، فرمانبرداری اور نافرمانی، حدود اللہ کی پابندی اور ان حدود سے تجاوز، دونوں کو نسبت دی گئی ہو، اور جس کی اطاعت پر جزا اور عصیان پر سزا کے مترتب ہونے کا ذکر کیا گیا ہو۔ وہ انسان ہی ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ:۔

وَمَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ (بقرہ - ۲۹)	جو لوگ اللہ کے حدود سے تجاوز کریں وہی ظالم ہیں۔
وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّھِمْ (اعراف - ۱۰)	انھوں نے اپنے رب کے حکم سے سرکشی کی۔
یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْٓا اِلَی الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ یَّکْفُرُوْا بِہٖ (النساء - ۹)	چاہتے ہیں کہ طاغوت کے پاس اپنا مقدمہ لے جائیں حالانکہ انھیں حکم دیا گیا تھا کہ اس سے کفر کریں۔
مَا ظَلَمُوْنَا وَلٰکِنْ کَانُوْٓا اَنْفُسَھُمْ یَظْلِمُوْنَ۔ (اعراف - ۲۰)	انھوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنے اوپر ظلم کرنے والے تھے۔
وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ یُدْخِلْہُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ	اور جو اللہ اور اسکے رسول کی اطاعت کرے اللہ اسے ایسی جنتوں میں داخل کریگا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ ....
وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیَتَعَدَّ حُدُوْدَہٗ یُدْخِلْہُ نَارًا خَالِدًا فِیْھَا (النساء - ۲)	اور جو اللہ اور رسول کی نافرمانی کریگا اور اسکے حدود سے تجاوز کریگا اسے اللہ دوزخ میں داخل کریگا جہاں وہ ہمیشہ رہے گا۔

یہ اور ایسی ہی بے شمار آیات ظاہر کرتی ہیں کہ انسان میں بخلاف دوسری تمام مخلوقات کے ایک ایسی قوت موجود ہے جس سے وہ اطاعت اور سرکشی دونوں پر قدرت رکھتا ہے۔ اور اسی قوت کے صحیح یا غلط استعمال سے فوز یا خسران، ثواب یا عقاب، انعام یا غضب کا مستحق ہوتا ہے۔

ہدایت و ضلالت قرآن اس مسئلہ کو اور زیادہ کھول کر بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا نے انسان کی

فطرت میں بھلے اور بُرے دونوں کی تمیز ودیعت فرمادی ہے۔

فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوٰهَا (الشمس) — اس کو فجور اور تقویٰ دونوں کا الہامی علم دیا۔

اس کو نیکی اور بدی دونوں کے راستے بتا دیئے۔

وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (البلد) — ہم نے اسے دونوں راستے دکھا دیئے۔

پھر اس کو اختیار دے دیا کہ جس راہ کو چاہے اختیار کرے۔

فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيلًا (الدہر ۲) — جو چاہے اپنے رب کا راستہ اختیار کرلے۔

فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (کہف ۴) — جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔

ایک طرف اس کو بہکانے کے لئے اس کا ازلی دشمن شیطان موجود ہے جو بدی کی راہ کو مزین کرکے اسے دکھاتا اور اس کی طرف رغبت دلاتا ہے۔

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ (الحجر ۳) — (ابلیس نے کہا) اے رب تونے جو مجھے گمراہ کیا تو اب میں بھی ان کیلئے زمین میں خوشنمائیاں دکھاؤں گا اور ان سب کو بہکاؤں گا۔

اور دوسری طرف اللہ کی جانب سے رسول بھیجے جاتے ہیں، کتابیں نازل کی جاتی ہیں تاکہ انسان کو نیکی کا سیدھا راستہ بدی کی راہ سے ممتاز کرکے دکھائیں۔

جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالزُّبُرِ وَبِالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ (فاطر ۳) — ان کے رسول ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں اور صحیفے اور روشن گر کتاب لائے۔

اس طرح انسان کے اندر اور اس کے گردوپیش مختلف قوتیں ہیں جن میں سے کوئی اس کو بدی کی طرف کھینچنے والی ہے اور کوئی نیکی کی طرف۔ ان قوتوں کے درمیان موازنہ کرنے کے لئے اس کو سمجھ بوجھ دی گئی ہے، اپنی راہ آپ دیکھنے کے لئے آنکھیں دی گئی ہیں اور اتنی قدرت دی گئی ہے کہ وہ جس راہ کو پسند کرے اس پر چل سکے۔ اگر وہ بدی کی راہ کو اختیار کرتا ہے تو اللہ اس کی تمام طبیعی قوتوں اور ان

خارجی اسباب کو جو اس کے نصیب میں لکھ دیے گئے ہیں اس کا تابع فرمان بنا دیتا ہے اور یہ راہ اس کے لئے آسان کر دی جاتی ہے۔ اسی طرح اگر وہ نیکی کا راستہ اختیار کرتا ہے تو وہ راہ بھی اس کے لئے آسان کر دی جاتی ہے۔

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى۔ (اللیل)

پس جس نے راہ خدا میں مال دیا اور خدا سے ڈرتے ہوئے کام کیا اور نیکی کی تصدیق کی اس کے لئے ہم سہل راستہ میسر کر دیں گے اور جس نے بخل کیا اور استغنا برتا اور نیکی کو جھٹلایا اس کے لئے ہم تنگی کی راہ میسر کر دیں گے۔

جو شخص گمراہی اختیار کرتا ہے اس کے ضمیر میں ایک الٰہی قوت پھر بھی موجود رہتی ہے جو اس کو راہِ راست کی طرف دعوت دیتی رہتی ہے، مگر جب وہ اپنی کجروی پر اصرار کرتا ہے تو یہ قوت کمزور ہوتی چلی جاتی ہے اور ضلالت کی بیماری بڑھتی جاتی ہے۔

فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا (البقرہ-۲)

ان کے دلوں میں بیماری ہے پھر اللہ نے ان کی بیماری کو اور بڑھا دیا۔

یہاں تک کہ ایک وقت آتا ہے جب اس قوت کا کوئی اثر باقی نہیں رہتا اور اس کے دل، آنکھوں اور کانوں پر ایسی مہر لگ جاتی ہے کہ وہ حق بات کو سمجھ نہیں سکتا، حق کی روشنی کا ادراک نہیں کر سکتا، حق کی آواز سن نہیں سکتا اور ہدایت کے تمام راستے اس کے لئے بند ہو جاتے ہیں۔

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ (البقرہ-۱)

اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر کر دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردے پڑ گئے ہیں۔

مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ انسان کا اختیار اور اس کی آزادی غیر محدود ہے اور اس کو کلیۃً وہ اختیارات تفویض کر دیے گئے ہیں جو قدریہ نے فرض کر لئے ہیں۔ ہرگز نہیں انسان کو کچھ اختیار

دیا گیا ہے وہ یقیناً ان قوانین کے ماتحت ہے جو اللہ نے تدبیرِ کُلّی اور تدابیر جزئیہ کے لئے مقرر کر رکھے ہیں اور جن کے تحت یہ سارا کارخانۂ قدرت چل رہا ہے۔ کائنات کے نظام میں انسان کی قدرت اور اس کی روحانی، نفسانی اور جسمانی قوتوں کے لئے جو حدیں اللہ نے قائم کر دی ہیں ان سے وہ ایک بال برابر بھی تجاوز کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ پس یہ حقیقت اپنی جگہ پر قائم ہے کہ:-

إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ (القمر-۳)	ہم نے جو چیز بھی پیدا کی ہے ایک اندازے پر پیدا کی ہے۔
إِنَّ اللَّهَ بَالِغُ أَمْرِهِ قَدْ جَعَلَ اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا (الطلاق-۱)	اللہ اپنے کام کو پورا کر کے رہتا ہے۔ اللہ نے ہر چیز کے لئے ایک اندازہ ٹھیرا دیا ہے۔
وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ (انعام-۲)	اور وہ اپنے بندوں پر غالب ہے۔

عدل اور جزا و سزا یہیں سے یہ نکتہ بھی حل ہو جاتا ہے کہ حقیقی عدل کرنے والا بجز خدا کے اور کوئی نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ وہ حدود جن کے دائرے میں انسان کو اختیار حاصل ہے خدا ہی کی قائم کی ہوئی ہیں اور خدا ہی اس حقیقت کا جاننے والا ہے کہ انسان کے اعمال میں اس کے اپنے اختیار کا حصہ کتنا ہے۔ اس نے جن حدود سے انسان کے اختیار کو محدود کیا ہے ان کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم کے حدود وہ ہیں جو تمام نوعِ بشری کے لئے من حیث المجموع قائم کئے گئے ہیں۔ اور دوسری قسم کے حدود وہ ہیں جو ہر شخص کے لئے فرداً فرداً مختلف طور پر مقرر ہیں۔ پہلی قسم کے حدود نوعی حیثیت سے تمام اولادِ آدم کے اختیار کو محدود کرتے ہیں، اور دوسری قسم کے حدود ہر شخص کے حالات کے لحاظ سے مختلف ہیں، اسی لئے ان کے اعتبار سے ہر شخص کی زندگی میں اس کے اختیار اور اس کی مجبوری کی مقداریں جدا جدا ہیں۔ اپنے اعمال کے لئے انسان کا ذمہ دار ہونا اور اس ذمہ داری کے لحاظ سے جزا و سزا کا مترتب ہونا اسی مقدارِ اختیار پر موقوف ہے جس کو ہر شخص نے اپنے افعال میں استعمال کیا ہے، اور یہ وہ چیز ہے جس کو تولنا، جانچنا، اور ایسا ٹھیک ٹھیک حساب لگانا کہ ایک ذرہ بھر بھی کمی بیشی نہ ہو دنیا کے کسی جج اور

کسی مجسٹریٹ کے بس کا کام نہیں ہے۔ یہ محاسبہ و موازنہ صرف فاطر السمٰوٰتِ والارض ہی کر سکتا ہے اور وہی قیامت کے دن اپنی عدالت کا اجلاس کرے گا یہی بات ہے جسکی طرف کلام اللہ میں جگہ جگہ اشارہ کیا گیا ہے۔

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ الْحَقُّ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهُ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ (اعراف-۱)

اس روز وزن بالکل ٹھیک ہوگا جن کے اعمالِ خیر کے پلڑے بھاری ہوں گے وہی فلاح پائیں گے اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے وہی وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے ہماری آیات کے ساتھ ظلم کرکے اپنے آپ کو خود نقصان پہنچایا ہے

اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ (غاشیہ)

ان کو ہماری ہی طرف آنا ہے اور ان کا حساب ہمارے ہی ذمہ ہے۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ۔
وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (زلزال)

جو ذرہ برابر نیک عمل کرے گا وہ اس کا نتیجہ دیکھ لے گا اور جو ذرہ برابر برا عمل کرے گا وہ اس کا نتیجہ دیکھ لے گا۔

قرآن مجید سے مسئلہ جبر و قدر پر بس اسی حد تک روشنی پڑتی ہے اور اس سے وہ گتھیاں سلجھ جاتی ہیں جو علوم طبیعیہ اور علم الاخلاق کے مباحث میں بیان کی گئی ہیں۔ رہے وہ مابعد الطبیعی مسائل جن میں فلاسفہ اور متکلمین الجھے ہوئے ہیں، یعنی یہ کہ اللہ کے علم اور اس کی معلومات، اس کی قدرت اور اس کے مقدورات، اس کے ارادہ اور اس کے مرادات میں کس نوع کا تعلق ہے، اور اس کے علمِ سابق، ارادہ ازلی اور قدرت مطلقہ کے ہوتے ہوئے انسان کس طرح با اختیار اور اپنے ارادہ میں آزاد ہو سکتا ہے، تو ان مسائل سے قرآن نے کوئی بحث نہیں کی ہے، اس لئے کہ انسان ان کو سمجھ نہیں سکتا۔

جبر و قدر

(ایک تقریر جو ۲۳ر اکتوبر ۴۲ء کو نشرگاہِ لاہور سے نشر کی گئی)

(باجازت آل انڈیا ریڈیو)

کیا ہماری تقدیر پہلے سے مقرر ہے؟ کیا ہماری کامیابی اور ناکامی، ہمارا گرنا اور ابھرنا، ہمارا بگڑنا اور سدھرنا، ہماری راحت اور تکلیف، اور وہ سب کچھ جو ہمارے ساتھ اس دنیا میں پیش آتا ہے، کسی اور طاقت یا اور طاقتوں کے فیصلہ کا نتیجہ ہے جس کے متعین کرنے میں ہمارا کوئی حصہ نہیں؟ اور اگر ایسا ہے تو کیا ہم بالکل مجبور ہیں؟ کیا ہم اس دنیا میں محض کٹھ پتلیوں کی طرح ہیں جنھیں کوئی اور نچا رہا ہے؟ کیا ہم کسی بنی بنائی اسکیم کو عمل میں لانے کے لئے بس ایک آلہ کے طور پر استعمال کئے جا رہے ہیں۔ گویا ہم دنیا کے اسٹیج پر ان ایکٹروں کی طرح ہیں جن میں سے ہر ایک کا کام پہلے سے کسی نے مقرر کر دیا ہو؟

یہ سوالات ہمیشہ سے ہر اس شخص کے دل میں کھٹکتے رہے ہیں جس نے کبھی دنیا اور انسان کے متعلق کچھ غور کیا ہے۔ فلسفی، سائنسدان، مورخ، متقنن، سماج اور اخلاق اور مذہب کے مسائل سے بحث کرنے والے، اور عام لوگ، سبھی کو اس گتھی سے اپنا دماغ لڑانا پڑا ہے کیونکہ سالک کی گاڑی یہاں آکر اٹک جاتی ہے اور آگے نہیں چلتی جب تک کہ اس کو کوئی نہ کوئی قابلِ اطمینان حل مل نہ جائے، چاہے وہ بجائے خود صحیح حل ہو یا غلط۔

محض ایک سادہ سی "ہاں" یا "نہیں" میں آپ ان سوالات کا جواب دینا چاہیں تو دے لیجئے، ممکن ہے کہ اس جواب سے آپ کا دل مطمئن ہو جائے، مگر خواہ آپ "ہاں" کہیں یا "نہیں"۔ دونوں صورتوں میں بے شمار دوسرے سوالات پیدا ہو جاتے ہیں جن کا جواب دینا آپ کی ہاں اور نہیں دونوں کے بس کا کام نہیں ہے۔

آپ "ہاں" کہتے ہیں تو پھر ساتھ ہی آپ کو یہ بھی مان لینا چاہئے کہ پتھر، لوہے، درخت، جانور اور انسان

میں کوئی حقیقی فرق نہیں ہے۔ سب کی طرح انسان بھی وہی کچھ کر رہا ہے جو اس کے لئے مقرر کر دیا گیا ہے۔ اختیار نہ ان کو حاصل ہے نہ اِس کو۔ شہد کی مکھی کا چھتہ بنانا اور انسان کا ریلوے لائن تیار کرنا، دونوں میں چاہے درجہ کا فرق ہو مگر نوعیت کا کوئی فرق نہیں کیونکہ اُس سے چھتہ اور اِس سے ریلوے لائن کوئی اور ہی بنوا رہا ہے، ایجاد کے شرف سے دونوں محروم ہیں۔ اس کے بعد آپ کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ دنیا کی دوسری چیزوں کی طرح انسان بھی اپنے افعال کا ذمہ دار نہیں ہے۔ ایک آدمی کا نیک کام کرنا اور ایک موٹر کا درست چلنا دونوں یکساں ہیں کسی آدمی کا جرم یا شرارت کرنا اور کسی سینے والی مشین کا خراب بخیہ کرنا دونوں کی ایک حیثیت ہے۔ اور جب معاملہ یہ ہے تو جس طرح آپ "نیک موٹر" "شریر مشین" "ایماندار انجن" "بدمعاش چرخہ" نہیں بولتے اسی طرح آپ کو آدمی کے لئے بھی نیک اور بد، شریر اور شریف، ایماندار اور بے ایمان، اور اسی قسم کے دوسرے الفاظ نہیں بولنے چاہئیں۔ یا اگر آپ بولتے ہی ہیں (کیونکہ جو کچھ آپ سے بلوایا جا رہا ہے وہ بولنے پر آپ مجبور ہیں)، تو کم از کم اتنا تو سمجھ ہی لینا چاہیے کہ یہ الفاظ بے معنی ہیں۔ پھر بات اسی پر ختم نہیں ہو جاتی۔ یہ مذہب اور اخلاق، یہ ہمارا قانون اور عدالتوں کا نظام، یہ ہماری پولیس اور جیل اور تفتیش جرائم کے محکمے، یہ ہمارے مدرسے اور تربیت گاہیں اور اصلاحی ادارے، سب بے معنی ہو جاتے ہیں اگرچہ کام یہ سب ہوتے رہیں گے، بند ان میں سے کوئی بھی نہ ہوگا، کیونکہ آپ کے نظریے کے مطابق ان سب ایکٹروں کو دنیا کے اسٹیج پر اپنا اپنا مقرر پارٹ ادا کرنا ہی ہے، مگر ظاہر ہے کہ جب مسجدوں کے نمازی اور مندروں کے پجاری، عدالتوں کے جج اور چوری اور ڈکیتی کے مجرم سب کے سب محض ایکٹر قرار پا جائیں، اور عبادت گاہوں سے لے کر چوری خانوں اور قید خانوں تک سب کے سب ایک بڑے ناٹک کے مختلف منظر قرار پائیں، تو اس کے معنی یہی ہیں کہ انسان کی پوری مذہبی و اخلاقی زندگی محض ایک کھیل اور تماشا ہے۔ وہ شخص جو رات کی تنہائی میں نہایت خلوص سے پوجا اور عبادت کر رہا ہے، اور وہ جو کسی کے گھر میں نقب لگا رہا ہے، دونوں اس تماشے میں بس وہ پارٹ ادا کر رہے ہیں جو ان کے سپرد کر دیا گیا ہے، ان کے درمیان کوئی فرق اس کے سوا نہیں ہے کہ ڈائرکٹر نے ایک کو سادھو کا پارٹ دیا ہے اور دوسرے کو چور کا۔ ہماری عدالت میں جج صاحب خواہ کتنی ہی

سنجیدگی کے ساتھ مقدمہ کی سماعت فرما رہے ہوں اور اپنی دانست میں مقدمہ کو سمجھ کر انصاف کرنے کی کیسی ہی کوشش کر رہے ہوں، مگر آپ کے اس نظریہ کی رو سے وہ اور مستغیث اور ملزم سب نرے ایکٹر ہیں اور بیچارے اس دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں کہ کر رہے ہیں ڈراما اور سمجھ رہے ہیں کہ عدالت کے کمرے میں واقعی عدالت ہو رہی ہے۔ یہ انجام ہے اس "ہاں" کا جو آپ نے شاید سرسری طور پر میرے ابتدائی سوالات کے جواب میں کر دی تھی۔

اچھا، تو کیا پھر آپ ان سوالات کا جواب "نہیں" کی صورت میں دیں گے؟ مگر مشکل یہ ہے کہ اس صورت میں بھی معاملہ ایک "نہیں" پر ختم نہ ہو جائے گا بلکہ اس کے ساتھ آپ کو بہت سی صریح حقیقتوں کا انکار کرنا ہوگا۔ جب آپ یہ کہتے ہیں کہ انسان کی تقدیر پہلے سے مقرر نہیں ہے اور یہ کہ اس کی تقدیر کسی بیرونی قوت کے فیصلہ سے نہیں بنتی تو غالباً آپ کے اس انکار کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ آدمی اپنی تقدیر آپ مقرر کرتا ہے، یعنی اس کی تقدیر اس کے اپنے ارادے اور کوشش کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس پر پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ کے اس بیان میں لفظ "انسان" سے کیا مراد ہے؟ فرداً فرداً ایک ایک آدمی؟ یا انسانوں کا ایک بڑا گروہ جسے سماج یا سوسائٹی یا قوم کہا جاتا ہے؟ یا پوری نوع انسانی؟ اگر آپ کا مطلب یہ ہے کہ ہر آدمی اپنی تقدیر آپ بناتا ہے تو ذرا ان چیزوں پر ایک نگاہ ڈال لیجیے جن سے تقدیر بنتی ہے، پھر فرمائیے کہ آدمی ان میں سے کس کس پر قابو رکھتا ہے۔ تقدیر بنانے کا پہلا سامان آدمی کے اعضا اور اس کی ذہنی اور جسمانی قوتیں اور اس کے اخلاقی اوصاف ہیں جن کی درستی اور خرابی، توازن اور عدم توازن، کمی اور بیشی کا فیصلہ کن اثر اس کی تقدیر پر پڑتا ہے۔ مگر یہ ساری چیزیں ہر انسان ماں کے پیٹ سے لے کر آتا ہے اور آج تک کوئی ایک آدمی بھی ایسا پیدا نہیں ہوا ہے جو خود اپنی تجویز اور اپنے انتخاب کے مطابق اپنے آپ کو بنا کر لایا ہو۔ پھر آدمی کی تقدیر کے بننے اور بگڑنے میں ان بہت سے اثرات کا دخل بھی ہوتا ہے جو ہر انسان کو وراثت میں اپنے آباء واجداد سے ملتے ہیں، پھر جس خاندان، جس سوسائٹی، جس طبقے، جس قوم اور جس ملک میں وہ پیدا ہوتا ہے اس کی ذہنی، اخلاقی، تمدنی، معاشی اور سیاسی حالت کے بے شمار اثرات دنیا میں قدم رکھتے ہی اس پر چھا جاتے ہیں۔ یہ ساری چیزیں آدمی کی

تقدیر بنانے میں حصہ لیتی ہیں، مگر کیا کوئی شخص ایسا ہے جس نے اپنی پسند اور اپنے انتخاب سے اُس نسل اور اُس ماحول کا تعین کیا ہو جس میں اسے پیدا ہونا ہے اور خود یہ فیصلہ کیا ہو کہ وہ ان میں سے کس کس کے کیا اثرات قبول کرے؟ اسی طرح آدمی کی تقدیر پر دنیا کے بہت سے واقعات اور اتفاقات کے بھی اچھے اور بُرے اثرات پڑتے ہیں۔ زلزلے، سیلاب، قحط، موسم، بیماریاں، لڑائیاں، معاشی اُتار چڑھاؤ اور اتفاقی حادثے اکثر انسان کی پوری زندگی کا رخ بدل دیتے ہیں اور اس کے اُن سارے نقشوں کو درہم برہم کر ڈالتے ہیں جو اس نے بڑے سوچ بچار اور بڑی کوششوں سے اپنی راحت اور اپنی کامیابی کے لئے بنائے ہوتے ہیں۔ اور اس کے برعکس بارہا یہی اتفاقات اچانک ایک انسان کو ایسی کامیابیوں تک پہنچا دیتے ہیں جن کے حصول میں فی الواقع اس کی اپنی کوشش کا بہت کم دخل ہوتا ہے۔ یہ ایسی نمایاں حقیقتیں ہیں جن سے انکار کرنے کے لئے بڑی ہٹ دھرمی کی ضرورت ہے۔ پھر آخر یہ کیسے مان لیا جائے کہ آدمی اپنی تقدیر آپ بناتا ہے۔

اب اگر آپ اپنے دعوے میں ترمیم کر کے یہ کہتے ہیں کہ افراد نہیں بلکہ قومیں اپنی تقدیر خود بناتی ہیں تو یہ بھی ماننے کے قابل بات نہیں۔ ہر قوم کی تقدیر جن اسباب سے بنتی ہے ان میں نسلی خصوصیات، تاریخی اثرات، جغرافی حالات، قدرتی وسائل اور بین الاقوامی صورت حال کا بہت بڑا دخل ہوتا ہے، اور یہ بات دنیا کی کسی قوم کے بس میں نہیں ہے کہ وہ ان اسباب کی گرفت سے آزاد ہو کر اپنی تقدیر جیسی چاہے خود بنا لے۔ پھر وہ قانونِ قدرت جس کے تحت زمین و آسمان کا انتظام ہو رہا ہے اور جس میں دخل دینا تو درکنار اسے پوری طرح جان لینا بھی کسی قوم کے بس کا کام نہیں ہے، اس طرح قوموں کی تقدیر پر اثر ڈالتا ہے کہ اس کے روکنے یا اس سے بچنے کی طاقت کسی قوم کو حاصل نہیں۔ یہ قانون پسِ پردہ اپنا کام کرتا رہتا ہے اور کبھی اچانک اور کبھی بتدریج اس کے عمل سے ایسے نتائج رونما ہوتے ہیں جو اُبھرتی ہوئی قوموں کو گرا دیتے اور گرتی ہوئی قوموں کو اُبھار دیتے ہیں۔ خیر یہ تو وہ اسباب ہیں جو صریح طور پر انسانی دسترس سے باہر ہیں مگر جو اسباب بظاہر انسان کی دسترس میں ہیں ان کا تفصیلی جائزہ بھی کچھ بہت امید افزا نہیں ہے۔ ایک قوم کی تقدیر بننے کا بہت کچھ انحصار

اس پر ہے کہ اسے مناسب رہنمائی (لیڈرشپ) میسر آئے اور اس کے افراد کی ایک اچھی خاصی تعداد میں صفات اور وہ خصوصیات موجود ہوں جو اس رہنمائی سے فائدہ اٹھانے کے لئے ضروری ہیں۔ مگر تاریخ سے ہم کو ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی، اور نہ اپنے زمانہ کے مشاہدات میں ہم ایسی کوئی نظیر پاتے ہیں کہ کسی قوم نے ان دونوں چیزوں کے حاصل کرنے میں آزادی کے ساتھ خود اپنے ارادے اور انتخاب سے کام لیا ہو۔ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ جب ایک قوم کے اُبھرنے کا وقت آتا ہے تو اُس کو اچھی رہنمائی بھی میسر آجاتی ہے اور اس میں وہ خصوصیات بھی پیدا ہو جاتی ہیں جو اس رہنمائی کی کامیابی کے لئے مطلوب ہیں۔ اور وہی قوم جب گرنے لگتی ہے تو رہنمائی اور پیروی دونوں کی قابلیتیں اس سے اس طرح رخصت ہو جاتی ہیں کہ اس کا کوئی دردمند بھی خواہ انھیں واپس نہیں لا سکتا۔ ہمیں کچھ خبر نہیں کہ وہ کون سا قانون ہے جس کے تحت تاریخ اقوام کے یہ نشیب و فراز واقع ہوتے ہیں۔

پھر کیا قوموں کو چھوڑ کر آپ پوری نوع انسانی کے متعلق یہ حکم لگائیں گے کہ وہ اپنی تقدیر آپ بناتی ہے؟ مگر یہ کہنا اور بھی زیادہ مشکل ہے۔ نسلوں اور قوموں میں بٹی ہوئی، ملکوں میں پھیلی ہوئی، بے شمار مختلف تمدنوں اور تہذیبوں میں رنگی ہوئی، اور لاتعداد زبانیں بولنے والی ایک نوع کے متعلق اگر کوئی شخص یہ فرض کرتا ہے کہ اس کا کوئی ایک مجموعی ارادہ ہے جس کے مطابق وہ سوچ سمجھ کر اپنی تقدیر معین کرتی ہے، تو حقیقت میں وہ ایک بڑی عجیب بات فرض کرتا ہے۔ کیا واقعی اس نوع نے اپنی رفتارِ ترقی کے لئے یہ ٹائم ٹیبل خود بخود تجویز کیا تھا کہ فلاں دور تک یہ پتھر کے اوزاروں سے کام لے گی، پھر لوہے اور آگ کو استعمال کرنا شروع کرے گی؟ فلاں عہد تک انسانی اور حیوانی طاقت سے کام کرتی رہے گی، پھر مشین کی طاقت استعمال کرنے لگے گی؟ فلاں صدی تک کمپاس کے بغیر کشتیاں چلائے گی پھر اپنی سمت سفر معین کرنے میں کمپاس سے کام لے گی؟ پھر کیا وہ نوع انسانی ہی ہے جس نے افریقہ، امریکہ، یورپ، ایشیا اور آسٹریلیا کی مختلف قوموں یعنی خود اپنے مختلف حصوں کے لئے مختلف تقدیریں معین کی ہیں؟ ظاہر ہے کہ ایسے عجیب و غریب دعوے کرنے کا خیال بھی کوئی ہوشمند آدمی نہیں کر سکتا۔

اس کے بعد آپ کے لئے اپنی اس رائے پر قائم رہنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ انسان اپنی تقدیر آپ بناتا ہے۔ کیونکہ جب نہ ہر فرد اپنی تقدیر کا مالک ہے، نہ افراد کا کوئی مجموعہ، نہ پوری نوع، تو یہ تقدیر کی ملکیت آخر کس "انسان" کے حصہ میں آئے گی؟

آپ نے دیکھا، وہ سوالات جو میں نے ابتدا میں آپ کے سامنے پیش کئے تھے، ان کا جواب نہ محض "ہاں" کی صورت میں دیا جا سکتا ہے اور نہ محض "نہیں" کی صورت میں۔ حقیقت ان دونوں کے درمیان ہے جو زبردست ارادہ کائنات کے اس زبردست نظام کو چلا رہا ہے اس سے آزاد ہو کر کوئی چیز دنیا میں کام نہیں کر سکتی، بلکہ کام کرنا کیا معنی جی بھی نہیں سکتی۔ ایک ہمہ گیر اسکیم ہے جو پوری قوت کے ساتھ زمین و آسمان میں چل رہی ہے۔ کسی میں اتنا بل بوتہ نہیں ہے کہ اس اسکیم کے خلاف چل سکے یا اس کو بدل سکے یا اس پر کوئی اثر ڈال سکے۔ ہمارے جتنے علوم ہیں، جتنے تجربات، جتنے مشاہدات ہیں سب کے سب اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ کائنات کی اس سلطنت میں کسی کی خود مختاری کے لئے قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔ آسمان کے بڑے بڑے کروں کو جس نظام کی بندش اپنے مقرر کردہ راستہ سے بال برابر جنبش نہیں کرنے دیتی، زمین کو جس طاقت نے ایک ضابطہ کے مطابق گردش کرنے پر مجبور کر رکھا ہے، ہوا اور پانی اور روشنی اور گرمی و سردی پر جس حکومت کا مکمل اقتدار ہے، انسان کی پیدائش سے پہلے جس قوت نے وہ اسباب فراہم کئے جن سے اس زمین پر انسان کا موجود ہونا ممکن ہوا، اور جس قوت کے اختیارات کا یہ حال ہے کہ اسباب زندگی کے توازن میں اگر وہ تھوڑا سا رد و بدل بھی کر دے تو ہماری پوری نوع آن کی آن میں فنا کے گھاٹ اتر سکتی ہے، اس کے تحت رہتے ہوئے انسان کے لئے ایسی آزادی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ یہ اپنی تقدیر جیسی چاہے خود بنا لے۔

مگر یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ وہ طاقت جو ہمیں اس دنیا میں لائی ہے جس نے ہم کو علم، غور و فکر، ارادے اور فیصلے کی قوتیں دی ہیں، جس نے ہم میں یہ احساس پیدا کیا ہے کہ ہم کچھ اختیار رکھتے ہیں، جس نے ہم

میں یہ صلاحیت پیدا کی ہے کہ ہم نیک و بد میں امتیاز کرتے ہیں، اخلاقی اور غیر اخلاقی افعال میں فرق کرتے ہیں، اور دنیا کے معاملات میں ایک طرزِ عمل اختیار کرتے اور دوسرا طرزِ عمل ترک کرتے ہیں، اُس نے یہ سب کچھ ہمارے ساتھ محض مذاق کے طور پر کیا ہے، ہمیں اس کائنات کی تدبیر و انتظام میں انتہا درجہ کی سنجیدگی نظر آتی ہے، مذاق اور کھیل اور تمسخر کہیں نظر نہیں آتا۔ لہٰذا حقیقت وہی ہے جو وجدانی طور پر ہم میں سے ہر شخص محسوس کرتا ہے، یعنی فی الواقع ہم کو یہاں ایک محدود پیمانے پر کچھ اختیارات دئے گئے ہیں اور ان اختیارات کے استعمال میں ہم مناسب حد تک آزاد بھی رکھے گئے ہیں۔ یہ آزادی حاصل کی ہوئی نہیں ہے بلکہ دی ہوئی ہے۔ اس کی مقدار کتنی ہے؟ اس کے حدود کیا ہیں؟ اس کی نوعیت کیا ہے؟ اس کا تعین مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ مگر اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ آزادی ہے ضرور۔ کائنات کی عالمگیر اسکیم میں ہمارے لئے یہی جگہ تجویز کی گئی ہے کہ ہم ایک محدود پیمانہ پر آزادانہ کام کرنے والے ایکٹر کا پارٹ ادا کریں۔ ہمارے لئے یہاں اُتنی ہی آزادی ہے جتنی آزادی کی اس اسکیم میں گنجائش ہے۔ اور ہم اخلاقی حیثیت سے درحقیقت اُسی قدر ذمہ دار ہیں جس قدر ہم کو آزادی بخشی گئی ہے۔ یہ دونوں امور کہ ہم کس قدر آزاد ہیں اور ہم پر اپنے افعال کی ذمہ داری کتنی ہے ہمارے دائرۂ علم سے باہر ہیں۔ ان کو وہی طاقت جان سکتی ہے جس نے اپنی اسکیم میں ہمارے لئے یہ مقام تجویز کیا ہے۔

یہ نظریہ ہے جو اس مسئلہ میں مذہب نے اختیار کیا ہے۔ مذہب ایک طرف قادرِ مطلق خدا پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ہم اور ہمارے گرد و پیش کی ساری دنیا خدا کی محکوم ہے اور اس کا اقتدار سب پر چھایا ہوا ہے۔ دوسری طرف وہ ہم کو اخلاق کے تصورات دیتا ہے، نیکی اور بدی میں فرق کرتا ہے، اور ہمیں بتاتا ہے کہ اگر ہم ایک راستہ اختیار کریں گے تو ہمیں نجات حاصل ہوگی اور دوسرے راستہ پر چلیں گے تو ہم کو سزا دی جائے گی۔ یہ بات صرف اسی صورت میں معقول ہو سکتی ہے کہ ہم واقعی اپنے اختیار سے اپنی زندگی کا راستہ منتخب کرنے میں آزاد ہوں۔

قرآن
کی
چار بنیادی اصطلاحیں

الٰہ، رب، دین اور عبادت یہ چار الفاظ قرآن کی اصطلاحی زبان میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ قرآن کی تعلیم کو سمجھنے کے لئے ان چاروں اصطلاحوں کا صحیح اور مکمل مفہوم سمجھنا بالکل ناگزیر ہے، اگر کوئی شخص نہ جانتا ہو کہ الٰہ اور رب کا مطلب کیا ہے، عبادت کی کیا تعریف ہے، اور دین کسے کہتے ہیں، تو دراصل اس کے لئے پورا قرآن بے معنی ہو جائے گا۔ وہ نہ توحید کو جان سکے گا، نہ شرک کو سمجھ سکے گا، نہ عبادت کو اللہ کے لئے مخصوص کر سکے گا اور نہ دین ہی کو اللہ کے لئے خالص کر سکے گا۔

پس یہ حقیقت ہے کہ محض ان چار بنیادی اصطلاحوں کے مفہوم پر پردہ پڑ جانے کی بدولت قرآن کی تین چوتھائی سے زیادہ تعلیم، بلکہ اس کی حقیقی روح نگاہوں سے مستور ہو گئی ہے اور اسلام قبول کرنے کے باوجود لوگوں کے عقائد و اعمال میں جو نقائص نظر آتے ہیں ان کا ایک بڑا سبب یہی ہے۔

پس اگر آپ قرآن مجید کی مرکزی تعلیم اور اس کے حقیقی مدعا کو سمجھنا چاہتے ہیں تو "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحوں" کا مطالعہ فرمائیے۔

مکتبہ جماعت اسلامی۔ دارالاسلام۔ پٹھان کوٹ (پنجاب)

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش

حصہ اول

اِسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ، موجودہ حالت اور مستقبل کے امکانات پر ایک سبق آموز تبصرہ جس سے مسلمانانِ ہند کے قومی مسئلہ کا ایک نیا تصور پیدا ہوتا ہے۔ اِس کتاب کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی ضرورت ہے۔ اسلیئے قیمت بہت کم رکھی گئی ہے

حصہ دوم

اِس حصہ میں ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات پر مفصل تبصرہ کر کے بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی غفلت سے اِس وقت تک مُلک کے سیاسی تغیرات کس طرح اصول اسلام اور مسلمانوں کے قومی مفاد کے خلاف ہوتے رہے ہیں اور یہ کہ اگر اب مسلمان اپنی قومی زندگی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں کونسی پالیسی اختیار کرنی چاہیئے۔ اِس کی قیمت بھی اشاعت عام کے لئے بہت کم رکھی گئی ہے:۔

حصہ سوم

مسلمانوں کی موجودہ سیاسی کشمکش کا عملی حل کیا ہے۔ اسلامی حکومت کن اصولوں پر قائم کیجاسکتی ہے۔ ایسا اِقدام کرنے والے گروہ کو کن اصولوں پر منظم کیا جاسکتا ہے، اور اِن اصولوں پر جس قدر اعتراضات وشبہات کئے جاسکتے ہیں، اُن کا جواب کیا ہے؟ یہ تمام باتیں اِس حصہ میں شرح وبسط کے ساتھ بیان کر دی گئی ہیں:۔

قیمت حصہ اول ۱-۴-۰ حصہ دوم ۲-۸-۰ حصہ سوم ۲-۰-۰

محصول ڈاک علاوہ

ملنے کا پتہ — مکتبہ جماعت اسلامی دارالاسلام جمالپور۔ پٹھانکوٹ (پنجاب)

TOWARDS UNDERSTANDING ISLAM

BY

SAYYID ABUL-ALA MAUDUDI

This small book is an attempt at a clear and concise interpretation of Islam. The chief aim in view has been to present within a brief space the most systematic and logical conception of Islam to build a coherent and organic structure of human life on the basis of this conception and to give a comprehensive and lucid account of what this religion in reality is.

All the prominent journals and dailies of India have highly spoken of this little book. Order your copy just now. Price Rs. 3/-. Available from The Manager, Tarjuman-ul-Quran, Jamalpur F. F., District Gurdaspur.

WHAT IS ISLAM?

BY

Mohammad Mazharuddin Siddiqi

To understand Islam in its original purity and to grasp its essentially revolutionary message, you should not fail to read this book. It will tell you that ISLAM is not mere religion, but a dynamic social order having its own peculiar approach to social and economic questions. Begin your study of ISLAM and its application to modern problems by reading this book.

Price Re. 1/8.

Maktaba-e-Jama'at-e-Islami

Darul Islam, Pathankot, (Punjab)